چراغ پھولوں کے
مسرور جہاں

پندرھویں صدی ہجری کے مبارک آغاز پر

مسرور جہاں

اشاعت اول نومبر ۱۹۸۰ء ------- ایک ہزار
مطبوعہ ------- جے۔ کے آفسٹ پرنٹرس
کتابت ------- ا۔ ح۔ جاوید
قیمت ـــــــــــ ۱۰ روپے

کریسنٹ پبلشنگ کمپنی

عبدالقادر مارکیٹ۔ جیل روڈ۔ علی گڑھ

فہرست

انتساب

ایس آئی ایم کے شاہینوں کے نام

نئی نسل کے ان پھولوں کے چراغوں سے پھیلنے والی خوشبو اور روشنی
نوجوان نسل کو ایک معطر اور روشن راہ زندگی تک رہنمائی کر سکے........
شاہراہ حیات پر چراغاں ہو جائے اور خوشبو، مہک اور روشنی نوجوان
ذہنوں کو صحت مند رجحانات بخشے

تاکہ

مسرور جہاں

عرض ناشر

پندرھویں صدی ہجری کے مبارک آغاز پر یہ افسانوی مجموعہ پیش کرتے ہوئے سی، پی، سی، دلی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ افسانوی ادب میں ہمارا یہ پہلا قدم ہے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

موجودہ افسانوی ادب "لذتیت" اور "بے مقصدیت" کا شکار ہے۔ وہ نئی نسل کے اخلاق و کردار اور رویوں پر انتہائی خراب اثرات مرتب کر رہا ہے۔ ضرورت اور حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ایسے افسانے تخلیق کئے جائیں جو مثبت اقدار کے حامل اور منفی اقدار کے قاتل ہوں تاکہ نئی نسل میں بدکرداری، بے چینی اور بے راہ روی کے خلاف نفرت کے جذبات ابھریں اور وہ صالح و صحتمند روایات کے امین اور خیر و فلاح کے علمبردار بن سکیں ـــــ بس یہی وہ مقصد ہے جسکی خاطر ہم نے یہ مجموعہ شائع کرنے کی جسارت کی ہے۔

"چراغ پھولوں کے" کی افسانہ نگار "مسرور جہاں" صاحبہ تاریخ و تہذیب کے اہم مرکز لکھنؤ سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ نے ایک علمی و ادبی گھرانہ میں زندگی کا آغاز کیا تھا۔ والد مرحوم پروفیسر شیخ حسین خیال لکھنوی ایم اے اچھے شاعر تھے۔ دادا مرحوم پروفیسر شیخ مہدی حسن ناصری لکھنوی ایم اے صاحب دیوان شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف و مترجم تھے۔ مسرور جہاں کو بچپن ہی سے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا ذوق ابھرا ۱۹۵۲ء میں پہلی کہانی قومی آواز لکھنؤ سے شائع ہوئی اور پھر ہند و پاک کے مختلف رسائل میں کہانیاں اور افسانے شائع ہونے لگے۔ موصوفہ کے چالیس ناول شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مسرور خیال کے نام سے لکھتی تھیں۔ انھیں اردو اکیڈمی اتر پردیش کی جانب سے ایوارڈ مل چکے ہیں اور اردو سروس دہلی سے افسانے نشر بھی ہو چکے ہیں۔

مسرور جہاں کے ددھیال کا ماحول زمینداری کا تھا۔ والد محترم مدرس تھے جسکی بنا پر گھر کا ماحول متوسط تھا، شوہر کا تعلق نواب خاندان سے تھا۔ اس پس منظر کی وجہ سے ان کے افسانوں میں ان تینوں طبقات کے ذہنوں اور ماحول کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتی ہیں وہ ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی دین ہے۔ فرضی کہانیاں نہیں ہیں۔

امید کہ قارئین اس مجموعہ کو پسند فرمائیں گے۔ اور اسے قبول عام حاصل ہوگا۔ (ناشر)

نقطۂ نظر

مسرور جہاں ہمارے دور کی معروف ناول نگار ہیں یہ ایک عرصہ سے لکھتی رہی ہیں اور ناولوں کے علاوہ افسانوں کی ایک بڑی تعداد کی خالق ہیں۔ قبولیت کا عالم کچھ یوں ہے کہ گھروں میں بیٹھنے والی بوڑھی عورتوں سے لیکر یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم نوجوانوں تک میں ان کی تحریریں خاصی پسند کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ ادبی تخلیقات کی کامیابی کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ معاشرہ کے ہر طبقہ میں پڑھی جائیں اور پسند کی جائیں۔

"چراغ پھولوں کے" ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل "دھوپ چھایہ" کی اشاعت ہو چکی ہے۔ جس کے چند افسانے بلاشبہ اردو افسانوی ادب میں قابل تعریف افسانے کہے جا سکتے ہیں۔

یوں تو مسرور جہاں کا خاص میدان ناول نگاری ہے اور اب تک تقریباً ۸۰ ناول لکھ چکی ہیں لیکن ادھر چند سالوں سے افسانوں کی طرف مائل ہوئی ہیں اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے فن کا اصل روپ انہی افسانوی تخلیقات سے واضح ہوا ہے۔ کہانی کی سادگی، انتہائی آسان زبان، عوامی انداز نگارش اور آسان تخیّل یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کو اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں جنم نہیں لیتیں بلکہ ابھرتی ہیں۔ یہ خصوصیت جو ہم عصر افسانہ نگاروں میں اب معدوم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مسرور جہاں کو اس مقام پر کھڑا کر دیتی ہے جہاں اس دور کے کم ہی مصنفین پہنچ پائے ہیں۔ "جدیدیت" جس نے بیسویں صدی کی پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور اردو مصنفین کا خاصا بڑا گروہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ مسرور جہاں کے افسانوں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اسکی وجہ غالباً یہی ہے کہ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ جدیدیت کے نمائندہ افسانے اور کہانیاں اپنے حلقۂ اثر کے اعتبار سے انتہائی محدود ہوتے ہیں۔ اور قارئین کے ذہنوں کو قلم کا ہمسفر بنانے میں اکثر ناکام رہتے ہیں جس کے

نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ ایک کہانی کار بلکہ اسکی تخلیق بھی عام انسانی ماحول سے ہٹ کر ایک انتہائی محدود دائرے میں سمٹ کر رہ جاتی ہے یہ صورت حال ان افراد اور گروہوں کے لئے تو اطمینان بخش ہو سکتی ہے جو ادب کو ایک PROFESSION کی حیثیت دیتے ہیں اور اسکو صرف دانش گاہوں اور ادبی محفلوں تک ہی محدود سمجھتے ہیں لیکن ان لوگوں کے نزدیک اسکی کوئی اہمیت نہیں جن کا نظریہ یہ ہے کہ ادب زندگی کے ارتقاء اور اسکے فروغ کا ایک اہم ذریعہ ہے ۔

مسرور جہاں جس دور سے تعلق رکھتی ہیں وہ ان ادیبوں کا دور ہے جو ادب برائے زندگی کے قائل تو ہیں اور جن کی گفتگو اور تحریر دونوں ہی اس جذبہ کی مظہر ہوتی ہیں لیکن ان کی تخلیقات زندگی سے بہت دور اور ان افسانوں سے قطعی نا آشنا ہیں جن کی نمائندگی خود یہ حضرات کرتے ہیں ۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ صورتحال اس بنا پر ہے کہ ہمارے آج کے ادیب دراصل تقلید کا شکار ہیں جو بجائے خود تو کوئی خراب شے نہیں لیکن اجتہادی نظر سے کورے ہونے کی بنا پر ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ اسی کے نتیجہ میں ہمارے انتہائی ذہین اور صاحب فن افراد اس سے متاثر ہو کر اپنا الگ دائرہ تعمیر کر لیتے ہیں اور اسے اپنی اصل دنیا سمجھ کر مگن رہتے ہیں ۔

اس مخالف ماحول کے باوجود مسرور جہاں اپنی روش پر قائم رہی ہیں اور اسی قدیم طرز کو اختیار کرتے ہوئے نئے نئے تجربات بھی کئے ہیں اور نئے نئے مسائل کو موضوع بنایا ہے ۔ حالانکہ ان کی کہانیوں کا پس منظر معاشرتی ہوتا ہے ۔ لیکن اس حد تک حقیقت سے قریب کہ قاری انھیں اپنی کہانی خیال کرتا ہے ۔ وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتی ہیں اور واقعات کا احاطہ انتہائی باریکی سے اس طرح کرتی ہیں کہ کہانی ان کے قلم کے سہارے بہنے لگتی ہے ۔

مسرور جہاں کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمارے اردو ادیبوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتی ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ان قدروں پر یقین رکھتا ہے جس کے سوتے مذہبی اقدار اور دینی جذبوں سے پھوٹتے ہیں ۔

مسرور جہاں کی تخلیقات ان اقدار و روایات کی امین ہیں جو ہمارا روحانی و ملی اثاثہ ہیں ۔ انھوں نے ان روایات کو اپنے ناولوں اور افسانوں میں انتہائی مناسب انداز میں جگہ دی ہے ۔ یہ کہنا تو خاصا مشکل ہے کہ یہ عمل کس حد تک PREDETERMINED ہے لیکن اگر SPONTANEOUS بھی ہے تو

.....ذہنوں پر اس کے انتہائی مثبت اثرات مرتسم ہوتے ہیں جن کے ذریعہ زندگی کے اچھے رجحانات کو ثبات ملتا ہے منفی رجحان کو شکست ہوتی ہے اور بحیثیت مجموعی ایک تعمیری زاویۂ نگاہ پرورش پانے لگتا ہے۔

مسرور جہاں کی افسانوی تخلیقات میں جو بات ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ان کا انتہائی جذباتی اور ہیجان انگیز واقعات کے بیان سے فرار ہے۔ اس کے باوجود کہ ان کا قلم ان واقعات کا احاطہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے چاہے تو تنفس میں حدّت اور رفتار قلب کو تیز کر سکتا ہے، اور انھوں نے اپنے ناولوں میں اپنی اس قوت اظہار کا استعمال بھی کیا ہے لیکن معیاری افسانوی نگارشات اس جذباتی اظہار سے عام طور پر پاک ہیں اور بحیثیت مجموعی قارئین کو معاشرہ کے منفی رجحانات پر متنبہ کرتی ہیں اور مثبت اقدار کی اہمیت و ضرورت کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

مسرور جہاں کی تخلیقات مجموعی طور پر تعمیری طرز فکر کی عکاسی کرتی ہیں اور قاری کے ذہن کو تعمیر پسندی اور اعلیٰ اقدار و روایات سے متاثر کرتی ہیں لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تاثر انتہائی "مضمحل" ہوتا ہے جس کے دیرپا اثرات مرتب نہیں ہو پاتے۔ نتیجہ کے طور پر تفریح طبع کی خاطر پڑھی جانے والی یہ تخلیقات قاری کے ذہن کو متحرک نہیں کر پاتیں اور وہ مثبت اثرات جو ذہن پر آہستگی سے مرتسم ہوتے ہیں بہت جلد اپنا اثر کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رفتار اثر اتنی سست ہوتی ہے کہ کہانی کی "مقصدیت" پر لذتیت اور جذباتیت غالب ہو جاتی ہے۔

یہ صورتحال ان کے افسانوں میں اکثر اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب ان کی تخلیق میکانیکی عمل کے تحت وجود میں آتی ہے ورنہ مسرور جہاں "دھوپ دھوپ سایہ" اور "بیساکھی" جیسے افسانوں کی بھی خالق ہیں جو بالکل عام کہانیاں ہیں لیکن جس گہری نظر سے واقعات کا احاطہ کیا ہے وہ ان کی افسانوی عظمت منوانے کے لئے کافی ہیں۔

ادب کی کسی صنف میں قوت اثر کا اصل سرچشمہ دراصل وہ زاویۂ نگاہ ہے جس سے ایک ادیب واقعات کا تجزیہ کرتا ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ جتنا حقائق کے قریب ہوگا اور جس قدر قریب سے زندگی کی ترجمانی کریگا تخلیق اتنی ہی پر اثر اور قوی ہوگی۔ دراصل زاویہ نگاہ ہی وہ FORCE ہے جو ادیب کو زندگی کے ارتقاء اور فروغ کی جدوجہد میں ایک اہم مقام عطا کرتا ہے۔ اگر یہ زاویہ نگاہ نہ ہو تو ادیب محض ایک فنکار بن کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے دور کا المیہ یہ ہے کہ معروف ادیبوں کی فہرست ان افراد سے پُر ہے جو یا تو کوئی زاویۂ نگاہ نہیں رکھتے یا اگر رکھتے ہیں تو حقائق سے بہت دور ہوتا ہے۔ لیکن ادیبوں کا ایک گروہ وہ بھی ہے جو غیر شعوری طور پر کسی نظریہ کا حامل ہے۔ اور ان کی تخلیقات کسی نہ کسی طرح اس نظریہ کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔ مسرور جہاں اسی گروہ سے متعلق ہیں اور ان کی ہر تخلیق اس نظریہ کی غمازی کرتی نظر آتی ہے لیکن بظاہر ان کی یہ کوشش شعور و فکر سے منسلک نہیں ہوتی اسی بنا پر ان کی تخلیق اس قوت سے محروم رہ جاتی ہے جو ذہنوں کو سنوارنے کیلئے انتہائی ضروری ہے۔

ماضی قریب کے افسانوں میں مسرور جہاں ہمیں آئینہ دکھاتی محسوس ہوتی ہیں اور ماحول کو اس طرح عیاں کرتی ہیں کہ معاشرہ میں موجود اچھائیوں اور برائیوں کا نہ صرف یہ کہ احساس ہوتا ہے بلکہ ان سے نفرت و محبت کے جذبے بھی جنم لیتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی کامیاب ادیب کی خصوصیات ہیں۔ لیکن مثبت نظریات سے COMMITMENT اور باشعور زاویۂ نگاہ نہ ہونے کی بنا پر مسرور جہاں کا قلمی سفر اسی مقام پر آ کر رک جاتا ہے۔ "نفرت" یا "اطمینان" کا احساس پیدا ہو جانا یقیناً بہت بڑی کامیابی ہے لیکن بہر حال یہ STATIC حالت ہے جو ارتقا کی ضامن نہیں ہو سکتی ہے۔ جمود کی اس کیفیت کو ختم کئے بغیر ادب سے ہم کوئی تعمیری کام نہیں لے سکتے۔ اس میں تحریک پیدا کئے بغیر ہم ارتقا کی طرف گامزن نہیں ہو سکتے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قاری کے ذہن میں احساس تشنگی کا جنم ہی دراصل جمود توڑنے کی تحریک کا سبب ہوتا ہے۔ یہ صحیح تو ہے لیکن اسوقت جب کہ تشنگی کے ساتھ ہی ساتھ منزل کے نشان کی طرف اشارہ بھی ہو ورنہ صورتحال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہوگی جیسا کہ ایک مریض کو صرف تشخیص سن کر ہوتی ہے۔

ایک اور اہم خصوصیت جو مسرور جہاں کے فن کو ممتاز کرتی ہے وہ واقعات کا انتخاب ہے۔ اقدار کے اعتبار سے مسرور جہاں نے مثبت اور منفی دونوں قسم کے افسانے تحریر کئے ہیں لیکن ایک خوبی تو یہ کہ انھوں نے بہترین توازن قائم رکھا ہے اور دوسرے یہ کہ منفی کو منفی حیثیت سے اور مثبت کو مثبت حیثیت ہی سے پیش کرتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسرور جہاں اقدار و روایات پر یقین رکھتی ہیں ان کے اثرات سے بخوبی واقف ہیں اور ان کی کمی کو ایمانداری سے محسوس بھی کرتی ہیں اسی طرح جن تبدیلیوں کو غلط سمجھتی ہیں ان کے خطرات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ نسبتاً اس گروہ سے بہت دور ہیں جس کی نظر معاشرہ میں چھپی برائیوں تک محدود ہے اور یہی برائیاں ان کا بہترین موضوع بنتی ہیں جنکے

ذریعہ نفرت کا احساس ہی نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ احساس بھی پرورش پاتا ہے کہ برائیاں ہمارے معاشرہ کا لازمی جزہیں۔

"چراغ پھولوں کے" جن افسانوں پر مشتمل ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا انتخاب بطور خاص کیا گیا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر افسانے مقصدیت سے پُر ہیں۔ یہ ایک انتہائی خوش آئند قدم ہے اور ان ادیبوں کے لئے ایک عمدہ مثال بھی جو ادب کو انسان کی تعمیر نو کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں مقصدیت اور فن کو یکجا کرنا اور پھر ان میں توازن برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہیں اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ دو میں سے کوئی ایک پہلو متاثر ہو جاتا ہے۔ لیکن فنکار کی عظمت اسی میں مضمر ہے کہ وہ کس حد تک اس توازن کو برقرار رکھ پاتا ہے آجکل ایسے افراد موجود تو ہیں لیکن سستی کا شکار ہیں۔ مسرّ درجہاں کی یہ کوشش ایک انتہائی مثبت قدم ہے اور امید ہے کہ انشاءاللہ یہ اشاعت ان حلقوں میں جمود کو توڑ کر فعالیت کی طرف گامزن کرنے کا باعث بنے گی۔

مقصدیت اور تعمیر کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر اس مجموعہ کا تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو نسبتاً بہت سے نا تمام پہلو سامنے آئیں گے جن پر مصنفہ کو متوجہ کرنا ضروری ہے۔ اس میں فنی پہلو بھی ہو سکتے ہیں اور مقصدی پہلو بھی لیکن فی الحال ہم ان تمام گوشوں سے صرف نظر کریں گے کیونکہ مسرّ درجہاں ابھی لکھ رہی ہیں اور انشاءاللہ لکھتی رہیں گی اور جب تک یہ امید قائم ہے یہ توقع کی جانی چاہئے کہ مسرّ درجہاں ضرور ان ذہنوں کی نمائندگی کریں گی جو ادب کو ذہنی ارتقاء اور زندگی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ان کی تخلیقات ان اقدار حیات کی ترجمانی کریں گی جو نوجوان نسل کے ذہن کی تعمیر نو کی حقیقی ضامن ہیں اور انسانی رفعت کا منتہائے عروج۔

"ابن رسا"

بنجر زمین کا درد

بیس سال کا بنا ہوا آہنی قلعہ، دیکھتے ہی دیکھتے زلزلہ کے ایک ہی جھٹکے میں اڑا اڑا دھڑام کرکے...... کچی مٹی کے تودے کی طرح ڈھیر ہوگیا۔

ازدواجی زندگی کا یہ مضبوط اور خوبصورت قلعہ، جسے انھوں نے محبت، خدمت اور وفاؤں کے پتھر تراش کر بنایا تھا۔ اسکی تعمیر میں انھوں نے اعتماد اور یقین کے مصالحوں کی آمیزش کی تھی، جسے وہ ناقابل تسخیر سمجھتی تھیں...... لیکن ان کی یہ خوش فہمی تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ ایک دن اچانک ہی ان کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ اور یہ خوبصورت اور آہنی عمارت، ان کی نظروں کے سامنے —— ان کے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔ اور وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح، محبتوں اور تمناؤں کے اس تاج محل کو ریزہ ریزہ ہوکر بکھرتے دیکھتی رہیں۔ اور کچھ نہ کرسکیں —— بس دونوں مکانوں کے درمیانی دروازہ میں قفل لگا کر انھوں نے سلمان میاں سے ہر رشتہ اور ہر تعلق منقطع کر لیا۔ انھوں نے تو یہ بھی بھول جانا چاہا کہ سلمان میاں ماضی میں ان کے شریک زندگی تھے۔ یا یہ کہ وہ کبھی ان کی چہیتی بیوی تھیں۔ اور انکی دنیا رشکِ ارم تھی...... اس دروازے کو بند کر کے انھوں نے اپنے اوپر زندگی اور اس سے وابستہ خوشیوں کے سارے دروازے بند کر لئے کہ اب ان کی زندگی حسرتوں کا ایک مزار تھی۔

تاج آرا بیاہ کر سسرال آئیں تو چودہ برس کی الھڑ اور معصوم لڑکی تھیں۔ ابھی تو ان کی چہیتی گڑیا...... "شبنم" کے بیاہ کو بھی سال پورا نہیں ہوا تھا کہ ارمان زدہ ماں باپ نے چاؤ چونچلوں سے ان کو دلہن بنا کر رخصت کردیا۔ سلمان میاں کی اماں جانی کو بھی تاج آرا اتنی پسند آئی تھیں کہ وہ بڑے ارمانوں سے انھیں بیاہ لائیں۔ اور جب عمر میں لڑکے آزادی کا لطف اٹھاتے ہیں سلمان میاں بیوی والے بن گئے لیکن اپنی کم سن دلہن کا دل ہاتھ میں لینے کا گر انھیں خوب آتا تھا۔ تنہا سلمان میاں انکی کئی سہیلیوں

کا بدل ثابت ہوئے۔ اور ساس سسر نے ماں باپ کی محبت اور کمی کا احساس بھلانے کی ہر ممکن کوشش کی حتیٰ کہ تاج آرا میکہ کو بھول کر سسرال کا دم بھرنے لگیں۔ میاں کے نخرے سہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ تو خود ان کی اتنی ناز برداری کرتے تھے کہ تاج آرا کو اپنی قسمت پر ناز ہونے لگتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی سال گذر گئے۔ پیار و محبت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں انھیں کسی کمی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب ایک ایک کرکے ساس اور سسر دونوں گذر گئے۔ تو گھر کی ذمہ داری تاج آرا پر آگئی۔ ابھی تک تو وہ خود ہی بچہ بنی رہیں۔ اب ایکدم سے اپنے بڑے پن کا احساس ہوا تو انھیں اپنی گود کے سونے پن کا خیال بھی آگیا۔ تاج آرا نے سلمان میاں سے اس کا ذکر کیا تو وہ ہنس کر ٹال گئے۔ انھیں بیوی کی نادانی پر ہنسی آرہی تھی کہ مشکل سے بیس اکیس سال تو ان کی عمر ہوگی۔ اور ابھی سے اتنی ناامیدی۔؟ جب کہ اس عمر کی لڑکیاں تو کنواری ہی رہنا پسند کرتی ہیں۔ سلمان میاں نے تاج آرا کو آزردہ دیکھا تو ان کی دلدہی کی خاطر کہنے لگے۔

"تاجو بھئی ہم تو ایسے ہی ٹھیک ہیں۔ بچّے ہوجائیں تو چار دن میں حسن پر مکھیاں بھنکنے لگتی ہیں۔ اور اچھا خاصا خوبصورت جسم گوشت کا لجلجا بے ہنگم ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔ سچ پوچھو تو عشق و محبت کا سارا مزہ ہی کرکرا ہوجاتا ہے۔ جانم! ہم تو یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ ہماری اتنی حسین مہ جبیں دلہن اتنی مکروہ ہوجائے کہ دیکھنے سے بھی گھن آنے لگے۔"

"یہ آپ نہیں سمجھ سکیں گے سلمان! کہ عورت ماں بنکر کتنی حسین اور باوقار ہوجاتی ہے ممتا خود ایک حسن ہے۔ جس پر دنیا کا سارا حسن اور رعنائیاں قربان ہوجاتی ہیں۔"

تاج آرا نے بڑی حسرت سے کہا۔

"تاجو! پروردگار کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ ہمیں اس پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ دیر سویر سہی اسکی نوازش ہوگی ضرور ہوگی۔"

میاں کی تسلی سے تاج آرا بھی بہل گئیں اور کچھ عرصہ کے لئے یہ موضوع ختم ہوگیا۔ سلمان میاں چاہتے بھی یہی تھے۔

اس بار تاج آرا کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئیں اور آزردگی سے کہنے لگیں۔

"سلمان! مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی"۔
"کیا تمہیں آزادی اور فراغت کی زندگی پسند نہیں بیگم؟"
"بہت آزاد رہ لئے سلمان! اب تو دل بے اختیار ان ننھی منی باہوں کی قید کے لئے تڑپتا ہے جو گلے میں ہار بن کر لپٹ جائیں۔ وہ ہمارے جسم و جان کے ٹکڑے ——— جن کے کام ختم ہونے نہ آئیں اور ہمیں وقت کی کمی کا شکوہ ہو۔ ایسا بھی وقت کس کام کا جو کاٹے نہ کٹے"۔

اور اس بار سلمان میاں انھیں جھوٹی تسلی سے نہ بہلا سکے اور شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر کو انھیں دکھایا ——— پھر چیک اپ سے لیکر ایک چھوٹے آپریشن تک کئی مرحلے طے ہوئے اور تاج آرا بڑی امیدوں سے اس دن کا انتظار کرنے لگیں جب وہ سلمان کو باپ بننے کی خوشخبری سنا سکیں۔ لیکن اس دن کے انتظار میں دن، مہینے اور سال بیت گئے۔ لیکن "وہ دن" نہ آیا ——— ایک اور آپریشن ہوا اس کے بعد ساری امیدیں دم توڑ گئیں اور تاج آرا مرجھا کر رہ گئیں۔ زندگی کا جو خلا ایک ننھا سا وجود پُر کر سکتا تھا اب ہمیشہ کے لئے ان کا مقدر بن چکا تھا۔

تاج آرا نے سلمان میاں پر دوسری شادی کے لئے بہت زور دیا۔ لیکن انھوں نے سختی سے انکار کر دیا۔ اور انھیں یقین دلایا کہ وہ اولاد کے بغیر بھی بہت خوش اور مطمئن ہیں ——— جوش اور جنوں کا وہ دور گذر گیا تو تاج آرا بھی صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ بلکہ اب تو کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچنے لگتی تھیں کہ اگر ان کے کہنے میں آکر سلمان دوسری شادی کر لیتے تو خود ان کا مقام کیا ہوتا؟

کیا آج سلمان پر اور اس گھر پر ان کا اتنا ہی حق ہوتا؟ پھر پرایا بچہ پرایا ہی ہوتا ہے۔ وہ تو پھر بھی خالی ہاتھ رہتیں۔ بلکہ کچھ تلخیوں کا اضافہ ہی ہو جاتا۔ اور پھر خدا جانے سلمان کی محبت کا پلڑا کس طرف زیادہ جھکتا؟ ان کی طرف جو خالی ہاتھ تھیں۔؟ یا اسطرف جہاں ایک عورت کے ساتھ اس کے حقوق کو مضبوط کرنے کے لئے ایک دوسرا وجود بھی ہوتا۔؟

کم از کم اب وہ مطمئن اور پُرسکون تھیں۔ ان کے مکان سے ملا ہوا دوسرا چھوٹا مکان تھا جہاں سلمان میاں کی نشست رہتی تھی۔ شطرنج کی بازیاں جمتیں، مشاعرے ہوتے۔ ادبی نشستیں ہوتیں۔ اور تاج آرا بے فکر رہتیں۔

اندیشوں اور وسوسوں کے زمانے ختم ہو چکے تھے۔ میاں کے آنے جانے اور دیر سویر کی فکر نہ انھیں

پہلے کبھی رہی کہ وہ خود ہی ان کے بغیر زیادہ دیر نہیں رہ سکتے تھے۔ نہ اب وہ ان کے لئے فکر مند رہتی تھیں سلمان میاں کی چاہتوں نے سنجیدہ اور باوقار انداز اختیار کر لیا تھا۔ خود ان کی دنیا، گھر اور شوہر تک محدود تھی اور اپنی مخصوص سلامت روی سے گذر رہی تھی کہ ——— اچانک وہ زلزلہ آگیا ——— جس نے ان کی ازدواجی زندگی کے مضبوط قلعے کو آن واحد میں ڈھا دیا۔ تاج آرا ذہنی طور سے اس حادثہ کے لئے تیار نہیں تھیں۔ اور سلمان میاں کا یہ اقدام اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھیں۔ پھر جب ذرا سنبھلیں تو انھیں شوہر سے یہ گلہ ضرور رہا کہ انھوں نے تاج آرا کو بتائے بغیر ان سے چھپا کر دوسری شادی کی۔ وہ انھیں اپنے اعتماد میں لیکر، انھیں بتا کر عقد کرتے تو انھیں اتنی تکلیف نہ ہوتی بیس برس کا بنا ہوا بھرم ایسا ٹوٹا تھا کہ وہ خود آپ اپنی نظروں میں گر گئی تھیں۔ سُبک ہو گئی تھیں، حقیر ہو گئی تھیں۔

محبت کا بندھن کب کمزور ہوا —؟ کب ٹوٹا؟ اس بندھن کے ٹوٹنے میں مرزا صاحب کی غربت کا زیادہ قصور تھا۔؟ یا ان کے بانجھ پن کا؟ لیکن کچھ نہ کچھ تھا ضرور ورنہ محفلوں اور مشاعروں سے آباد مکان لکایک اتنا سنسان کیوں ہو جاتا؟ مرزا صاحب کی جواں سال بیٹی نے اس گھر کو آباد کیا تھا۔ یا ان کو برباد؟ یہ تو وقت ہی بتاتا ——— لیکن اتنا ضرور تھا کہ اپنی سب سے قیمتی چیز کے یوں چھن جانے کا تاج آرا کو دلی قلق تھا ——— اپنی قیمتی سے قیمتی چیز کوئی مانگ لے تو دل کو ایک قسم کی طمانیت اور سکون رہتا ہے۔ لیکن وہی چیز جب زبردستی چھین لی جائے کہ "دینے کا حق" بھی ختم ہو جائے تو کسک پیدا ہونا فطری بات ہے۔ کچھ ایسا ہی تاج آرا کے ساتھ بھی تھا۔ اور یہ ان کا حق بھی تھا۔

مارے غصے، جھنجھلاہٹ اور کھسیانے پن کے انھوں نے بھی کبھی اس قفل کی چابی ان سے نہیں مانگی شاید وہ یہ بات اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ ایک ایسی "فاش" غلطی کا ارتکاب کرنے کے بعد وہ حکم اور التجا دونوں کے حق سے محروم ہو چکے ہیں۔

موسم پر موسم گذرتے رہے۔ لیکن تاج آرا کی زندگی میں پھر کوئی موسم لوٹ کر نہیں آیا۔ ہر سال کی طرح شبّو اس بار بھی دھانی کریلیوں اور سنہری بانکوں کا جوڑا لیکر ساون میں پہنانے آئی۔ لیکن اس بار انعام کے ساتھ جوڑیوں کا جوڑا بھی واپس کر دیا گیا ——— رکابدار نے نقرئی ورقوں میں لپٹا حلوا سوہن اور بادام کا حلوہ پیش کیا۔ لیکن سینیاں اسی طرح واپس آگئیں۔ رام اوتار کی ڈالی پر تو

______ تاج آرا نے نظر بھی نہیں ڈالی کہ دسہری اور ثمر بہشت کی مہک ان دنوں کی یاد دلاتی تھی۔ جب کیوڑا میں بسی ٹھنڈی اور میٹھی قاشیں دونوں ایک دوسرے کو کھلاتے تھے۔ جانی بیگم نے بھی اپنی قینچی اور تلے دانیاں اٹھا کر طاقچے پر رکھدیں۔ ان کی بہو بیگم نے لباسوں کی تراش خراش اور جبڑاؤ ٹنکاؤ میں دلچسپی لیناہی چھوڑ دی تھی۔ اب تو ایک ہی جوڑا کئی کئی دن ان کے جسم پر چڑھا رہتا تھا۔

تاج آرا کو زندگی کے گرم صحراؤں میں تپتی ہوئی ریت پر چلنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اور سلمان میاں شائد نئی نویلی دلہن کی ناز برداریوں میں یہاں کا راستہ ہی بھول گئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ بیاہتا سے ندامت میں قدم نہ اٹھتے ہوں۔ اکثر اس بند دروازے کے پاس سے گذرتے ہوئے وہ ٹھٹک کر رک جاتی تھیں۔ اس دروازہ کے دوسری طرف جو کوئی بھی تھی۔ وہ بہت ظالم، غاصب اور تنگ دل تھی۔ جو بنا کسی آہٹ کے چپ چاپ جئے جا رہی تھی۔ اسکی یہ خاموشی اور بھی جان لیوا تھی۔ شائد وہ اپنے مقام پر مغرور تھی۔ اور کیوں نہ ہوتی۔ وہ فاتح تھی اور تاج آرا مفتوح۔ وہ غالب تھی اور تاج آرا مغلوب۔

اس دن اچانک ہی بند دروازے پر دستک سن کر وہ چونک اٹھیں۔ ملازمہ کو اشارہ کیا۔ اس نے دریافت کیا بات ہے؟

" اپنی بیگم صاحبہ کو بلا دو۔ ان سے کہنا خدا کے لئے دروازہ کھول دیں۔"

"کیوں؟ کیوں کھولدیں دروازہ۔؟ اب یہاں تمہارے لئے کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ تو تم پہلے ہی لے چکیں۔" تاج آرا غصے سے چیخ اٹھیں۔

"تاج آپا۔ یہ۔ یہ درد میری جان لے لے گا۔ خدا کے لئے دروازہ کھولئے۔ میں۔ میں مرجاؤنگی

"درد" ______ تاج آرا کا ہاتھ بیساختہ اپنے پیٹ پر چلا گیا۔ آہ! اس درد کی اذیت سے محروم ہونے کی سزا میں وہ کیسی کیسی اذیتیں اٹھا رہی ہیں۔

تاج آرا نے اس درد کو اپنی کوکھ میں سرسراتے محسوس کیا جیسے خشک بنجر زمین میں اچانک کھیتی لہلہا اٹھی ہو۔ اور کانپتے ہاتھوں سے قفل کھول کر۔ انھوں نے دروازہ کے دونوں پٹ کھولدیئے۔ اور پتے کی طرح کانپتی ہوئی زرد سی لڑکی کو اپنی باہوں میں بھر لیا۔

ڈھلتا سورج

آنکھوں کے سامنے بجلی کا کوندا سا لپک گیا۔ اور عمّو کا ہاتھ بے اختیار اپنی مانگ کے پاس چمکتے ہوئے تاروں پر چلا گیا۔ روپہلی تاروں جیسے تار، جنکی چمک نے دل کے نہاں خانوں میں کسک پیدا کر دی تھی۔ اور وہ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔

"عمّو! چڑھتے سورج کی پوجا سارا زمانہ کرتا ہے۔ لیکن جب سورج ڈھل جاتا ہے۔ تو اندھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

گلریز کی آواز سرگوشی بن کر ابھری۔ عمّو نے آنکھوں میں مچلنے والے آنسوؤں کو روکنے کے لئے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے۔ گزرے ہوئے وقت کا حساب کرنا آسان نہیں تھا۔ لیکن عمّو کی نظروں کے سامنے کتابِ ماضی کے اوراق ایک کے بعد ایک کر کے کھلتے جا رہے تھے۔

"کیا زندگی پر چھانے والی یہ تیرگی کسی مظلوم کی بد دعا کی وجہ سے ہے۔؟"

عمّو نے خود سے سوال کیا۔ جواب کون دیتا۔ آس پاس سناٹوں کا راج تھا۔ تنہائی کا پہرہ تھا۔ اور وقت تیزی سے پیچھے لوٹ گیا۔

"عمّو! مبارک ہو۔" گلریز نے خوشدلی سے کہا۔

"کیسی مبارکباد؟" عمّو نخوت سے بولی۔

"میٹرک میں فرسٹ کلاس لانے پر۔"

گلریز اس طرح خوش تھا۔ جیسے وہی فرسٹ آیا ہو۔

"اچھا؟ تو گویا یہ بھی کوئی کارنامہ ہوا۔"

"کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ میرے لئے تو سکنڈ کلاس بھی لانا مشکل ہوتا ہے۔"

گلریز جھینپی جھینپی ہنسی ہنس دیا۔

"آپ کی بات اور ہے۔" عمو کے لہجے میں احساس برتری کی جھلک نمایاں تھی۔

گلریز نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ مٹھائی کا ڈبہ وہ پھوپھی جان کو پہلے ہی دے چکا تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھی حقے لگا رہی تھی۔ گلریز ان سے ملے بغیر ہی چلا گیا۔

عمو ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ خدا نے بھی اپنے خزانے سے بے حساب دولت اسے بخشی تھی صورت تھی تو وہ لاجواب۔ ذہانت تھی۔ تو وہ بے پناہ۔ ہر کلاس میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوتی رہی اور دل میں خواہشات کا بحر بیکراں موجیں مارتا رہا۔ مستقبل کے خوشگوار سپنوں میں خود بخود رنگ بھرتے چلے گئے۔

گلریز عمو کو جی جان سے پسند کرتا تھا۔ بظاہر توان کے ایک ہونے میں کوئی بات مانع نہیں تھی لیکن جب گلریز کا پیغام عمو کے لئے آیا۔ تو اس نے خود ہی انکار کر دیا۔ واجبی صورت شکل اور معمولی ذہن رکھنے والا گلریز اس کے معیار سے بہت پست تھا۔ محض گریجویٹ ہونا ہی تو کافی نہیں ہوتا۔ پھر سروس بھی کیسی؟ کلرک۔ جہاں زیادہ سے زیادہ ایک دن وہ ہیڈ کلرک بن سکتا ہے۔ اس کے سامنے تو زندگی کا بڑا خوبصورت خاکہ تھا۔ تعلیمی مدارج کا ایک بلند معیار تھا۔ اور شریک زندگی کے لئے اس نے جو شرطیں رکھی تھیں۔ گلریز ان میں سے کسی شرط پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے انکار کو حق بجانب سمجھتی تھی۔ اب یہ گلریز کا پاگل پن ہی تو تھا کہ خواہ مخواہ مجنوں کا بھیس اختیار کر کے گھر سے نکل گیا۔ اور فضاؤں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ پھر ایک دن سننے میں آیا کہ اسکا جہاز دھند میں کسی پہاڑی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ عمو ان دنوں یونیورسٹی میں بی۔ اے کی طالبہ تھی۔ اسکے چاروں طرف زندگی کی رعنائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ یونیورسٹی کی تعلیمی اور ثقافتی زندگی کی روح رواں تھی۔ تقریر اور تحریر کے ساتھ وہ اسٹیج کی کامیاب اداکارہ بھی تھی۔ ایک فنکشن میں اس کی ملاقات فاران سے ہوئی۔ وہ اسے پسند تھا۔ یہ دوستی شائد محبت میں بدل جاتی۔ لیکن فاران کی شادی ہو گئی۔ چند روز افسوس کرنے کے بعد وہ نارمل ہو گئی۔ اسے ابھی کون سا شادی بیاہ کرنا تھا۔ زندگی محض اس کا نام تو نہیں ہے کہ عورت ایک مرد کی لونڈی بن کر بچے پیدا کرے اور پھر سب کی خدمت کرے۔ اس کام کے لئے سماج کی بہت سی لڑکیاں خواہشمند ہوں گی۔ بے چاریاں اس کو زندگی کی تکمیل سمجھ کر خوش ہوتی ہیں۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد عمو کالج میں لکچرر ہو گئی۔ ساتھ میں وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاری بھی کر رہی تھی

اس کے لکچرر ہوتے ہی رشتوں کی باڑھ سی آگئی۔ شائد لڑکوں نے اپنی کمائی پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسی لئے وہ ملازمت کرنے والی لڑکیوں کو شریک حیات بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن لڑکیوں کا نقطۂ نظر بھی اب بدل چکا تھا۔ پہلے لڑکیاں شوہر کی کم اور زیادہ آمدنی کا حساب نہیں رکھتی تھیں۔ اور جو کچھ ملتا تھا۔ اسی پر قناعت کرتی تھیں۔ لیکن جب یہ لڑکیاں خود ملازمت کرنے لگیں۔ تو وہ ہونے والے شوہر کی آمدنی معلوم کرنے میں بھی دلچسپی لینے لگیں اپنے سے کم آمدنی والا شوہر اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ انکی یہ روش شائد حق بجانب بھی تھی۔

لیکن دولت مند لڑکوں کی اڑان تو آسمان تک جانے لگی تھی۔ ایسے میں بھلا وہ ان کے ہاتھ کیسے آتے؟ انھیں تو بلیک کی آمدنی ہی قبضے میں لا سکتی تھی۔ اور اسکے بعد تو وہ سچ مچ فضاؤں میں ہی پرواز کرنے لگتے تھے۔

عمو نے رشتوں کی تعداد کو بڑے غور نگاہوں سے دیکھا۔ سب کو جانچا۔ پرکھا۔ اور انکار کر دیا۔ چند سو روپلی کمانے والے کلرک۔ ٹیچر اور گھس گھس کرنے والے وکیل۔ اسکی نظروں میں نہ سما سکے۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور پیشہ۔ خواہ وہ فورمین ہی کیوں نہ ہوں۔ اسکی حساس طبیعت پر بار بن کر رہ گئے۔ وہ ٹھاٹھ سے لڑکیوں کو پڑھاتی رہی اور اپنا تھیسس مکمل کرتی رہی۔

والدین اس کے ناز نخرے اب بھی اٹھاتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی ان پر جھنجلاہٹ بھی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے اکثر یہ سوال کرتے نظر آتے تھے کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟ اسکے لئے آسمان سے کوئی فرشتہ اترے گا یا پرستان سے شہزادہ آئے گا۔ جمشید، ریاض، فیروز، قاسم وغیرہ ہر لحاظ سے اچھے تھے۔ لیکن اس نے کسی کو گھاس نہ ڈالی۔ وہ اس کے مستقبل کی طرف سے ناامید ہو گئے تھے۔

ایک روز عمو کے گھر کے سامنے کا نو تعمیر شدہ بنگلہ آباد ہو گیا۔ نئے کرایہ دار معقول لوگ تھے۔ گیرج میں خوبصورت سی گاڑی، اور گیٹ پر کھڑا چوکیدار ان کی امارت کے مظہر تھے۔

عمو کے ڈیڈی بہت ملنسار تھے۔ اس لئے جلد ہی انھوں نے "بٹ فیملی" سے جان پہچان کے مراحل طے کر کے تعلقات کو خوشگوار موڑ دیدیا۔ اب وہ اکثر بٹ صاحب سے گفتگو کرتے نظر آتے تھے۔ مریم اور سارہ بھی عمو کے پاس آتی تھیں۔ مختلف موقعوں پر وہ ایک دوسرے کی دعوتیں

بھی کرنے لگے تھے۔

بٹ صاحب ریاستی حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ نئی قدروں کے دلدادہ یہ خاندان عمو کو بھی پسند تھا۔

بٹ صاحب کا بڑا لڑکا فیض کناڈا سے چند ہفتے کی رخصت پر آیا تو دونوں گھروں میں بہار آگئی۔ عمو کو فیض ہر لحاظ سے پسند تھا۔ اسمارٹ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دولت مند۔ وہ اس کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ پھر اب اس کا تلاش کا جذبہ بھی تھک سا گیا تھا۔ اس لئے وہ فیض کا انتخاب کرنے میں ذرا نہ ہچکچائی۔ فیض نے بھی تو اسے بہت سراہا تھا۔ اسکی تعلیم، قابلیت اور ذہانت کی جی بھر کے تعریف کی تھی۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔

"کاش مجھے آپ جیسی لڑکی مل جائے تو اسے شریک زندگی بنا کر فخر محسوس کروں گا"۔

اور عمو نے اس کے سہارے خوبصورت خواب سجا لئے تھے۔ اس سے زیادہ ایک مہذب اور شائستہ نوجوان اور کیا کہہ سکتا تھا۔ سب کچھ تو صاف صاف کہہ دیا تھا فیض نے۔

ایک اتوار کو صبح ہی صبح مریم اور سارہ اسکے سر پر مسلط ہوگئیں۔

"باجی ہمارے ساتھ پک نک پر چلئے۔"

عمو نے بہت انکار کیا۔ لیکن وہ نہ مانیں۔ سارہ نے کہا "باجی یہ سوچ لیجئے آپ نہ گئیں تو ہماری ساری تفریح غارت ہو جائے گی۔" وہ دونوں خاصی پریشان تھیں۔

"وہ کیسے ۔۔۔؟" عمو مسکرا دی۔

"جی ہاں باجی! بھائی جان نے یہ صاف صاف کہہ دیا ہے کہ باجی نہیں جائیں گی تو پروگرام کینسل ہو جائے گا۔ پلیز باجی چلئے نا۔"

"باجی" ـــــــ یہ لفظ عمو کے کانوں میں گرم دہکتی ہوئی سلاخ بنکر اتر گیا۔ اور اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ اور مارے جھنجلاہٹ کے ڈھیر سارا کام لے کر بیٹھ گئی۔ حالانکہ صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ آرام کرے گی۔ لیکن اب تو ایسا لگتا تھا کہ سارا کام آج ہی کر ڈالے گی۔ الماری کے سارے کپڑے نکال کر اس نے بستر پر ڈال دیئے اور صفائی میں مصروف ہو گئی۔ الماری درست کر چکی تو کمرے کی باری آگئی۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی وہ جھاڑن لئے کمرے کی ایک ایک چیز صاف کر رہی تھی۔ اسی

وقت فیض آگیا۔ روز کی طرح تروتازہ۔ خوبرو اور اسمارٹ۔

"اوہو! آج تو بڑا کام ہو رہا ہے"۔

وہ دروازے میں کھڑا ہو کر چاروں طرف ناقدانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ عمو نے جھاڑن ایک طرف ڈال دیا۔ لیکن اس کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں ہوئی۔

"آپ ہم سے ناراض ہیں کیا؟" فیض اس کے قریب آگیا۔

"نہیں"۔ عمو نے بے اختیار انکار کیا۔ وہ اس کی پرکشش شخصیت کے سامنے بے بس سی ہو گئی تھی۔

"پھر آپ نے ہمارے ساتھ چلنے سے انکار کیوں کیا۔"؟

"انکار تو ـــ! وہ ہکلا گئی۔

"نہیں کیا نا" ـــ؟ فیض نے جلدی سے کہا۔ تو وہ بے اختیار ہنس دی۔ ساری غلط فہمی دور ہو گئی۔ مسرور سے لہجہ میں کچھ شوخ انداز میں کہنے لگی۔ "فیض! آپ بہت ضدی ہیں"۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ بس آپ جلدی سے تیار ہو جائیے۔ میں جا کر سارہ اور مریم کو خوش خبری سنا دوں کہ میری اچھی اچھی باجی چل رہی ہیں"۔

"نہیں ـــ نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی"۔ عمو چلا پڑی۔ فیض بوکھلا گیا۔ عمو پر جیسے دورہ پڑ گیا تھا۔

"کیا بات ہے باجی! ابھی تو آپ تیار تھیں۔ پھر"......

"پلیز ـــ آپ لوگ چلے جائیں۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں آرام کروں گی"۔ عمو نے بہت سنبھل کر نرمی سے کہا۔ ـــ فیض حیران اور پریشان سا چلا گیا۔ عمو بستر پر گر کر رونے لگی۔

تو اب وہ فیض جیسے لڑکوں کے لئے محض "باجی" بن کر رہ گئی ہے۔

اس نے شیشے میں اپنا سراپا دیکھا۔ سڈول جسم لیکن کچھ بھرا بھرا سا۔ جس سے اس کی شخصیت کچھ اور پرکشش اور باوقار ہو گئی تھی۔ رنگ روپ ماند نہیں پڑا تھا۔ بلکہ عارضوں کی سرخی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ جیسے پھول کھلنے کے دو چار دن کے بعد کچھ اور شوخ اور گہرے رنگ کا ہو جاتا ہے۔ جس سے اس کی دلکشی مزید بڑھ جاتی ہے۔ ہاں اب وہ ایسا ہی دلکش پھول بن گئی تھی۔ جو شباب کی حد پھلانگ کر پختگی اور شادی کا عجیب سا امتزاج پیش کرتا ہے۔ لیکن نو عمر اور نوخیز کلیوں کی اپنی الگ خوبصورتی ہوتی ہے۔ جن کے کلی

سے پھول بننے کے لمحات ہی دراصل حاصل حیات ہوتے ہیں۔ اور عموان لمحات کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

اس کے بعد وہ بٹ صاحب کے یہاں نہیں گئی۔ فیض آیا بھی تو وہ دو ایک رسمی باتوں کے بعد وہاں سے ٹل گئی۔ فیض چھٹیاں گذار کر واپس چلا گیا۔ اور عمو نے سکھ کی سانس لی۔ شائد اس لئے کہ فیض کی موجودگی اسے ایک تلخ حقیقت کا احساس دلاتی تھی۔

وقت گذرتا گیا ـــــــ وہ یونیورسٹی میں پروفیسر بن گئی۔ اب وہ ڈاکٹر عمارہ نعیم تھی۔ اس کے نام کے آگے مس لگا دیکھ کر اس کے ساتھی پروفیسر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر اسے کون سی مجبوری تھی جو زندگی کی بہاروں سے مونھ موڑے رہی اور تنہا اتنی دور تک چلی آئی ـــــــ کئی بار وہ ان کی گفتگو کا موضوع بنی۔ کسی نے اسے بہت بڑی "اسناب" (snob) کہا۔ کسی نے "سنکی" کا خطاب دیا۔ اور کسی نے اس کے حق میں فیصلہ دیا کہ دراصل وہ خود مختاری اور آزادی کی دلدادہ ہے۔ اس لئے شادی بیاہ کے چکر سے دور رہی ہے۔

پروفیسر عثمانی ان دنوں مس عمارہ پر زیادہ ہی مہربان تھے۔ اکثر وہ اسے کافی یا چائے کے لئے اپنے روم میں مدعو کرتے تھے۔ اور یہ التفات دوستوں کے لئے موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ پروفیسر عثمانی پینتالیس برس کے تھے۔ کچھ عرصہ قبل ہی ان کی اہلیہ فوت ہوئی تھیں اور لا ولد ہونے کی وجہ سے ابھی اس لائق تھے کہ ان سے کچھ رنگین داستانیں منسوب کر دی جائیں۔

ایک دن مس عمارہ کچھ ضروری کام کر رہی تھیں۔ چپراسی کئی بار آ کر اسے پروفیسر عثمانی کا پیغام دے چکا تھا کہ وہ چائے پر آپ کے منتظر ہیں۔

عمو نے کام ختم کیا۔ رومال سے چہرہ صاف کیا۔ پوڈر کا ہلکا سا پف چہرے پر پھیرا۔ لبوں پر لپ اسٹک کی تازہ تہہ جمائی۔ اور پرس سنبھال کر پروفیسر عثمانی کے روم کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی۔ "یار عثمانی! آج تمہیں بتانا ہوگا کہ آخر تمہارا کیا ارادہ ہے۔؟ مس عمارہ پر یہ عنائتیں بلا وجہ تو نہیں ہونگی"؟

یہ پروفیسر زبیری کی آواز تھی۔ عمو کے گال سرخ ہو گئے۔ کانوں کی لویں تپنے لگیں۔ وہ خود بھی تو پروفیسر عثمانی سے کچھ امیدیں وابستہ کر بیٹھی تھی۔ زندگی کے بحر زخار میں وہ کب تک اکیلی بھٹک سکتی تھی؟ اگر عثمانی نے اسکا ہاتھ تھامنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ انکار نہیں کرے گی۔ وہ اب

تھک چکی ہے۔ اب اس میں اتنی سکت نہیں ہے۔ کہ دو گام بھی تنہا چل سکے۔ اسے سہارے کی ضرورت ہے۔

عموّ نے دیوار کا سہارا لیکر آنکھیں موندلیں۔ وہ بہت خستہ نظر آرہی تھی۔ جب ہی پروفیسر عثمانی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"زبیری اگر شادی کرنا چاہوں تو لڑکیوں کی کمی تو نہیں ہے۔ مس عمارہ سے تو بس یوں ہی گپ شپ چلتی ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کہ بیچاری "ڈھلتا سورج" ہیں۔ ہاں کبھی یقیناً بہت حسین رہی ہوں گی۔ شادی نہ کر کے غریب نے خود پر بڑا ظلم کیا ہے۔"

اور عموّ کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ وہ تقریباً گھسٹتی ہوئی اپنے روم میں آئی۔ شیشے پر نظر پڑی تو مانگ کے پاس چمکتے ہوئے سفید تاروں کی جھلملاہٹ اسکی آنکھوں میں سما گئی۔ اور شیشے میں اسکا اپنا عکس دھندھلا سا گیا۔

سچ مچ اس کی زندگی کا سورج ڈھل چکا تھا۔

لیکن قصور کس کا تھا۔؟

داغ اُجالوں کے

زریں نے چند ماہ کے پنٹو کو باہوں میں سنبھال کر اسٹیشن پر قدم رکھا تو اسکی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ حالات نے اسے اپنا گھر ہی نہیں ـــــــ اپنا وطن تک چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا.....
.....اور آج وہ ایک اجنبی شہر اور اجنبی جگہ کو اپنی منزل سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھی......اجنبی چہرے.....اجنبی لوگ.....اور انجان راستے۔

رکشہ مختلف سڑکوں پر دوڑتا رہا۔ وہ متجسّس نگاہوں سے ان راہوں کو دیکھتی رہی۔ اسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر اس شہر نے ـ اور یہاں کے باسیوں نے اسے اپنانے سے انکار کر دیا تو وہ کیا کرے گی ـــــــ؟ کہاں جائے گی...؟ اس وسیع و عریض دنیا میں وہ کس پر بھروسہ کرے جب اپنے ہی پرائے ہو گئے.... تو پھر غیروں کا کیا شکوہ ـ؟ ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ یہاں چلی آئی تھی۔ اس کی نظریں تو اب معصوم پنٹو کے مستقبل پر تھیں، اور وہ اس کے لئے ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھی۔

رکشہ ایک جھٹکے کے ساتھ رکا تو وہ جیسے خیالوں سے چونک کر ہوش میں آ گئی۔ سامنے ہی ایک کوٹھی کا گیٹ تھا۔ اور گیٹ پر جو نیم پلیٹ لگی تھی۔ وہ اسکی سہیلی نجمہ کے شوہر کے نام کی تھی۔ اسکی منزل آ گئی۔ وہ نیچے اتری اور کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ اور پھر چند لمحوں کے بعد نجمہ اسے سینے سے چمٹائے کھڑی تھی۔ دونوں کی آنکھیں اشک بار تھیں۔

"تمہیں یہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی زریں"؟ نجمہ نے پنٹو کو گود میں لیکر پیار کیا۔

"نہیں! میں آرام سے پہنچ گئی۔"

"اچھا تم منہ ہاتھ دھو ڈالو۔ پھر ہم اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

نجمہ نے اسے باتھ روم بتایا۔ اور خود پنٹو کو گود میں لئے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اور ملازمہ کو چائے

کے لئے ہدایت دینے لگی۔

چائے کی میز پر دونوں سہیلیاں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ نجمہ نے اچانک زریں سے کہا۔
"ارے ہاں زریں! یہ تو بتاؤ کہ چپکے چپکے شادی بھی کرلی۔ اور یہ صاحبزادے بھی نازل ہو گئے لیکن تم نے مجھے کوئی اطلاع تک نہیں دی......؟"

"نجمہ دراصل میں بے حد پریشان رہی۔ پہلے تو امی کا انتقال ہوا۔ پھر پنٹو کے پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے"

"اُف ــــــ تم پر تو واقعی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کاش تم دو لفظ مجھے لکھ دیتیں۔ کچھ تو تمہارا غم ہلکا ہو جاتا۔"

"نجمہ میری بدحواسی کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں"۔ پھر وہ موضوع سخن بدل کر نجمہ سے پوچھنے لگی۔ "تم نے میرے لئے جو مکان لیا ہے۔ وہ یہاں سے کتنے فاصلہ پر ہے"؟

"بس چند قدم پر ہے میں تو چاہتی تھی کہ تم میرے ہی پاس رہتیں۔ لیکن خدا جانے تم نے کیوں منظور نہیں کیا"۔

"دراصل میں تمہاری خوشگوار زندگی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ تمہارے صاحب بہادر اپنی ہنستی کھیلتی زندگی میں کسی دوسرے کو حصہ دار بنانا قطعی پسند نہیں کریں گے"۔

"نہیں زریں وہ تو مہینے میں بیس دن شہر سے باہر رہتے ہیں۔ ان کا کام ہی ایسا ہے۔ اور میں قید تنہائی کی سزا بھگتتی ہوں"۔ نجمہ نے سنجیدگی سے افسردہ لہجہ میں کہا

"تب تو واقعی تمہاری حالت قابل رحم ہے۔ کاش یہ آنگن سونا نہ ہوتا"۔

"زریں! اسے میری بدقسمتی ہی کہو کہ میری تنہائیوں کا کوئی ساتھی نہیں ہے"۔

"خدا کی مصلحت کو کون سمجھ سکتا ہے۔ کہیں تو ضرورتمندوں کو محتاج رکھتا ہے۔ اور کہیں بن مانگے ہی دے دیتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہ پنٹو کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن ایک مصیبت کی طرح اسے میرے گلے منڈھ دیا۔ تم کو اولاد کی ضرورت تھی تو تم آج تک اس نعمت سے محروم ہو"۔

"ایسا نہ کہو بہن! تم کو جینے کا سہارا تو مل گیا ہے۔ میں تو اس سہارے سے بھی محروم ہوں"۔
اور پھر وہ دونوں اسکول کے زمانے کی باتیں کرنے لگیں۔ نجمہ کی شادی اسکی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ اور زریں کا تعلیمی سلسلہ برقرار رہا۔ دونوں میں خط وکتابت ہوتی رہتی تھی۔

پھر درمیان میں کچھ دنوں کے لئے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ زرین نے اپنی پریشانیوں میں سب کو بھلا دیا تھا۔ اب جو اس کی سروس اس شہر میں لگی۔ تو اس نے نجمہ کو ایک مکان کے لئے لکھ دیا۔ نجمہ یہ خوشخبری سن کر پھولے نہ سمائی۔ اتنے عرصہ کے بعد وہ پھر یکجا ہونے والی تھیں۔

رات کے کھانے کے بعد پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ نجمہ نے اسے چند روز کے لئے اپنے پاس ہی روک لیا تھا۔ برسوں کی جدائی کے بعد دونوں ملی تھیں۔ زرین نے اچانک نجمہ سے سوال کیا۔

"تمہاری شادی تو تمہارے خالہ زاد بھائی رضی کے ساتھ طے تھی۔ پھر یہ اشعر صاحب بیچ میں کہاں سے آن ٹپکے۔"؟

"اشعر کے ابو میرے ابا کے بزنس پارٹنر تھے۔ اشعر نے مجھکو دیکھا تو شادی کرنے کی ضد کر بیٹھے۔ اور ان کے ابا اشعر کا حصہ میرے نام لکھنے پر تیار ہو گئے۔ رضی کی بیروزگاری نے ابا کو پہلے ہی بدظن کر رکھا تھا۔ بس یہ سمجھو کہ مجھے بے زبان جانور کی طرح ہانک کر اشعر کے کھونٹے سے باندھ دیا گیا۔ بیچارے رضی یہ صدمہ نہ سہہ سکے۔ اور اپنی کاغذی ڈگریاں سنبھال کر سعودی عرب چلے گئے۔ اشعر شروع شروع میں تو میری محبت کا دم بھرتے رہے۔ لیکن ان کا یہ جوش جلد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب وہ اپنے کاروباری دوروں کے بہانے گھر سے فرار رہتے ہیں۔ اور میں تنہائیوں سے اپنا سر پھوڑا کرتی ہوں۔ اب تو میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اکثر مجھے اشعر کی عیاشی اور بے راہ روی کی خبریں ملتی ہیں۔ لیکن میں ان پر کان نہیں دھرتی۔ جو ہو رہا ہے ٹھیک ہے۔ میں اپنی قسمت پر شاکر ہوں۔"

"واقعی مرد کو ہر طرح کی کھلی چھوٹ ملی ہے۔ اور تمہاری کہانی تو ہر مشرقی لڑکی کی کہانی ہے۔ کبھی وہ شوہر کے ظلم و ناانصافی کا شکار ہوتی ہے۔ اور کبھی حالات کی ستم ظریفی کا نشانہ بنتی ہے۔"

زرین نے سرد آہ بھر کر کہا۔ اور نہ جانے کس جذبہ سے مغلوب ہو کر سوتے ہوئے پنٹو کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ———

زرین اپنے نئے فلیٹ میں آگئی تھی۔ نجمہ نے ضرورت کا ہر سامان اسے مہیا کر دیا تھا۔ اس لئے اسے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ اور وہ نجمہ کے خلوص کی قائل ہو گئی ———

نجمہ نے ننھے پنٹو کی ساری ذمہ داریاں خود سنبھال لی تھیں۔ زرین اسکول جاتی۔ تو پنٹو کو نجمہ کے پاس چھوڑ جاتی۔ نجمہ بھی خوش تھی۔ اسے اپنی تنہائیوں کا ایک ننھا ساتھی مل گیا تھا۔ وہ تمام دن اس سے

اپنا دل بہلایا کرتی۔

ایک دن ملازم شام کے وقت بنٹو کو زریں کے پاس چھوڑنے آیا تو اس نے اشعر کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اپنے دورے سے واپس آگئے تھے۔ دوسرے روز وہ بنٹو کو اپنے ساتھ اسکول لے گئی۔ اور سارا دن وہ اسکول کے بچوں، ٹیچروں اور ملازموں کے ہاتھ کا کھلونا بنا رہا۔ شام کو نجمہ اس کے گھر آدھمکی۔ اور بنٹو کو گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے بولی۔

"تم ہمارے بنٹو کو اسکول کیوں لے گئی تھیں۔؟"

"میں نے سوچا کہ تمہارے صاحب بہادر اتنے دن کے بعد گھر واپس آئے ہیں تو تمہیں ان کی دلجوئی اور خاطر داری کرنا چاہئے۔ بس یہی سوچ کر بنٹو کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"

"لیکن تم سے کس نے کہہ دیا کہ صاحب بہادر کو میری ناز برداریوں کی ضرورت ہے۔ وہ یہاں رہیں یا دورے پر جائیں۔ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ صبح کے گئے رات ہی کو گھر لوٹتے ہیں۔ "ایسی بات ہے تو تم بنٹو کو بلوالیا کرو۔ میں اشعر کی موجودگی میں تمہارے گھر نہیں آؤں گی۔"

"ایسا کیوں زریں ——— کوئی خطرہ وطرہ ہے کیا؟"

"نہیں اب کوئی خطرہ نہیں ——— سارے خطروں سے گذر چکی ہوں۔" زریں نے آہستہ سے کہا اور بات ختم ہوگئی۔

بنٹو کو نجمہ روزانہ ملازم سے بلوالیتی تھی۔ زریں اس کے گھر نہیں گئی۔ اور نہ ہی اس نے اشعر کو دیکھنے کی کوشش کی۔ نجمہ خود ہی اسکے پاس چلی آتی تھی۔ اور نجمہ نے اس سے یہ بھی بتایا کہ اشعر اور بنٹو کی خوب دوستی ہوگئی ہے۔ نجمہ اسکی احسان مند تھی کہ بنٹو کی وجہ سے اشعر اس کے نزدیک آگئے ہیں۔ بنٹو کی معصوم مسکراہٹوں اور طفلانہ حرکتوں نے اشعر کا دل تسخیر کرلیا ہے۔ اور نجمہ کی یہ باتیں سن کر زریں خوب ہنستی تھی۔ اسے خوشی تھی کہ اشعر نے بنٹو کو ایک "ناگوار وجود" نہیں سمجھا تھا۔ اب اس کے دل کا بوجھ کسی حد تک کم ہوگیا تھا۔

ایک دن بنٹو کو ہلکی سی حرارت ہوگئی۔ زریں اسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اوّل تو نئی نئی ملازمت تھی۔ پھر اسکول کے سالانہ انسپکشن بھی ہونے والے تھے۔ اس لئے وہ چھٹی نہ لے سکی۔ بنٹو کو نجمہ کا ملازم حسب معمول آکر لے گیا۔ اسکول میں برابر اس کا دھیان بنٹو میں لگا رہا۔ واپسی

میں اس کا دل نہ مانا تو وہ پنٹو کو ساتھ لے جانے کے خیال سے نجمہ کے گھر چلی گئی۔ برآمدہ پار کر کے جیسے ہی وہ کمرہ کے دروازہ پہنچی۔ اسے رکنا پڑا۔ اندر شاید اشعر تھے دروازہ کی طرف ان کی پشت تھی پنٹو کے بستر کے نزدیک ہی ایک کرسی پر دراز وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ آہٹ پاکر وہ بھی پیچھے کی طرف مڑے۔ اور پھر ایک برقع پوش خاتون کو دیکھ کر جلدی سے گردن موڑلی۔ زریں نقاب برابر کر چکی تھی۔ لیکن اشعر کی ایک جھلک دیکھتے ہی جیسے اسے کرنٹ کا زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لڑکھڑا گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ اگر وہ جلدی سے دروازہ نہ تھام لیتی تو شاید چکرا کر گر ہی پڑتی۔

اور پھر نجمہ دوڑی ہوئی آئی۔ اسے دروازہ میں کھڑا دیکھ کر مسرور لہجہ میں بولی۔

"ارے زریں ـــ تم! ـــ آؤ اندر آؤ۔ اندر اشعر ہیں پنٹو کے پاس۔ میں انھیں دوسرے کمرہ میں بھیجتی ہوں"۔ نجمہ کی آواز سن کر ہی اشعر دوسرے کمرہ میں جا چکے تھے۔

زریں ڈگمگاتے قدموں سے اندر آئی۔ اور اس کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ جس پر سے اشعر اٹھ کر گئے تھے۔

"پنٹو کی طبیعت کیسی ہے اب"؟ نجمہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"اب تو ماشاء اللہ ٹھیک ہے۔ آرام سے سو رہا ہے۔ صبح اشعر ڈاکٹر کو دکھلائے تھے۔ دوا پلادی۔ سارا دن کھیلتا رہا"۔

"تمہارا شکریہ کس زبان سے ادا کروں نجمہ"۔

"پھر وہی غیروں جیسی باتیں کرنے لگیں ـــــ بیٹھو میں چائے کیلئے کہہ دوں"۔

"نہیں میں چلتی ہوں مجھے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔ بنٹو جاگ اٹھے تو بھجوا دینا"۔

"افوہ! کام ـــ کام ـــــ تم تو کام کے پیچھے جان دینے پر تلی ہو"۔

"میں نہیں مروں گی نجمہ ـــ کئی بار موت کا فرشتہ میرے بہت قریب سے گذرا ہے۔ لیکن میں اتنی سخت جان ہوں کہ دیکھلو پھر بھی تمہارے سامنے زندہ بیٹھی ہوں"۔

"تم اس قدر مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تمہاری اس مایوسی اور افسردگی کا پنٹو کے ذہن پر برا اثر پڑے گا"۔

زریں مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ لیکن اسکی مسکراہٹوں میں کتنی آہیں پوشیدہ ہیں یہ صرف وہی جانتی تھی زریں بہت اداس سی ـــــ سست قدموں سے گھر پہنچی اور اٹیچی سے ایک فوٹو نکال کر

بغور دیکھنے لگی —— یہ اس کی نظر کا دھوکا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ اسکے عادل —— اور نجمہ کے شوہر اشعر۔ ایک ہی ہستی کے دو روپ تھے۔ ایک ہی پیکر کے دو نام —— عادل —— اشعر —— اشعر —— عا —— دل۔

"اف میرے خدا۔ میرے ساتھ تو نے کتنا بڑا مذاق کیا ہے کہ جب میں عادل کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ تو وہ غائب رہے۔ لیکن اب .... جبکہ میں ان سے وابستہ ساری یادوں کو تھپک کر سلا چکی ہوں۔ تو وہ اچانک .... اسطرح سامنے آ گئے ..... ان کا ملنا —— نہ ملنے سے زیادہ غضب ڈھا گیا۔

کتاب ماضی کے اوراق ایک کے بعد ایک اسکے ذہن کے سامنے الٹنے لگے۔ عادل اپنے بزنس کے سلسلے میں اکثر اس کے شہر میں آتے رہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مستقل ایک فلیٹ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہ فلیٹ زریں کے گھر کے قریب ہی تھا۔ کالج آتے جاتے اکثر دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا۔ نظروں کا تصادم ہوتا۔ تو دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی۔ اور آنکھوں میں پیار کے دیپ جل اٹھتے۔ اس نے نیا نیا کالج جوائن کیا تھا۔ دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی پردہ ترک کر دیا تھا۔ پردہ ترک ہوتے ہی نت نئے فیشنوں کا سیلاب سا آگیا۔ اور آزادی کی نئی نئی راہیں کھلتی گئیں۔ اماں نے زریں کی بڑھتی ہوئی آزادی اور بے راہ روی پر روکا ٹوکا۔ لیکن جذبات میں آیا ہوا طوفان ان پابندیوں کی کب پرواہ کرتا ہے۔ وہ تو اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو اپنے پرزور طوفانی ریلے میں بہالے جاتا ہے۔

عادل سے ملاقاتیں بڑھیں۔ ساتھ گھومنے اور فلم دیکھنے کے پروگرام بننے لگے۔ اور زریں۔ انجام سے بے پرواہ پیار کی ڈگر پر آنکھیں بند کئے دوڑتی رہی —— پھر زریں کے اصرار پر عادل نے اس سے باقاعدہ شادی کر لی۔ کیونکہ زریں کے دل میں ابھی شرافت اور غیرت کی رمق باقی تھی۔ اور وہ شادی کے بغیر۔ ان فاصلوں کو پار کرنے کے حق میں نہیں تھی جہاں مشرقیت نے مرد اور عورت کے درمیان ایک حدِ فاصل برقرار رکھی تھی۔ زریں اپنے مجازی خدا اور اپنے محبوب کے ساتھ بہت خوش تھی۔ پھر ایک دن عادل اس سے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو رضامند کر کے اسے اپنے ساتھ لے جائیگا زریں نے اسکی بات پر اعتبار کیا۔ شوہر پر بے اعتباری کا سبب بھی کیا تھا؟ عادل اپنے پیروں پر کھڑا

تھا۔ اپنی مرضی کا مالک و مختار تھا۔ اور اس نے اپنی پسند سے اس کے ساتھ شادی کی تھی۔ دونوں خوش تھے۔ پھر اب تو ان کے گلشن حیات میں ایک کلی کھلنے والی تھی۔

وقت گذرتا گیا لیکن عادل واپس نہ آیا۔ اور ان کے پیار کی نشانی کلنک کا ٹیکہ بن گئی۔ اس کی رسوائی ہونے لگی۔ ضعیف ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور بتاشے کی طرح بیٹھ گئی۔ زریں ماں کے بعد بالکل ہی تنہا رہ گئی تو مجبور ہو کر اس نے ایک گمنام قصبہ میں پناہ لی۔ وہ اسکول کے بچوں کو پڑھا کر وقت گذارنے لگی۔ یہاں اس نے سب سے یہی کہا تھا کہ پنٹو کا باپ ایک حادثہ میں ہلاک ہو گیا گاؤں والوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ پنٹو اب چند ماہ کا ہو چکا تھا زریں نے اخبار میں ملازمت کا اشتہار دیکھ کر درخواست دی اور ملازمت پکی ہو گئی تو وہ گاؤں چھوڑ کر اس شہر میں آگئی۔ جہاں اسکی اسکول کی ساتھی۔ اسکی گہری سہیلی نجمہ رہتی تھی۔ نجمہ کی وجہ سے اسے بڑی ڈھارس رہتی تھی۔ کتنے عرصہ کے بعد اسنے سکون کی سانس لی تھی۔ لیکن شائد اسکی قسمت سے سکون رخصت ہو گیا تھا آج اشعر کو اچانک دیکھ لیا۔ جو حقیقت میں اس کا عادل تھا۔ اس کا مجازی خدا۔ اسکا محبوب۔ یہ کتنا خوفناک مذاق کیا ہے قدرت نے میرے ساتھ۔ —— وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ دل ہی دل میں نجمہ سے بھی شرمندہ تھی۔ انجانے میں اس نے اپنی سہیلی کے حق اور خوشیوں پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس رات وہ ایک لمحہ کے لئے نہ سو سکی اور تمام رات روتی رہی۔

نجمہ اب بھی اس کے پاس آتی تھی۔ اسے زریں کی خود فراموشی پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ ان دنوں اس کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ اس روز کے بعد وہ نجمہ کے گھر نہیں گئی۔ وہ اشعر کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ایک روز اشعر نے نجمہ سے کہا۔ "نجمہ۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم پنٹو کو ہمیشہ کے لئے اپنا لیں۔ سوچو تو۔ یہ ننھا سا وجود ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔"

"میرے دل میں بھی کئی بار یہ بات آئی کہ زریں سے پنٹو کو مانگ لیں۔ لیکن اس سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کا یہی واحد سہارا ہے۔ وہ اسکی جدائی کو ہرگز برداشت نہ کرے گی۔ اس کے مرحوم شوہر کی یہی تو ایک نشانی ہے۔"

"میں ان کے جذبات سمجھتا ہوں۔ لیکن پنٹو کو ان سے جدا کئے بغیر ہی اسے اپنانے میں کیا حرج ہے۔

وہ بھی یہیں ہمارے پاس رہیں۔ اس طرح ہم سب کی نظروں کے سامنے رہے گا۔

نجمہ نے زریں کو بطور خاص بلوا بھیجا تو وہ آگئی۔

"زریں ــــــ میں آج تم سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں"۔

"اتنا تذبذب کس لئے نجمہ۔ تم میری جان بھی مانگو گی تو انکار نہ کروں گی"۔

"ہاں ــــ ارادہ تو تمہاری جان ہی مانگنے کا ہے۔ لیکن ذرا ٹھہرو میں اشعر کو بھی بلالوں۔ تاکہ ایک گواہ بھی تو موجود رہے۔ مبادا اکل کلاں تم وعدہ سے مکر جاؤ"۔

زریں ہنس پڑی۔ اور اشعر کو بلانے کی اجازت دیدی۔

پردہ کے دوسری طرف اشعر بیٹھ گئے۔ نجمہ نے گفتگو شروع کی ــــــ "اشعر میں زریں سے اس کی قیمتی چیز مانگ رہی ہوں۔ یہ وعدہ بھی کر رہی ہے۔ آپ اس بات کے گواہ رہئے گا"۔

"زریں تم نے وعدہ کیا ہے ناکہ میری ہر بات مانو گی"۔

"ہاں میں صدق دل سے وعدہ کر رہی ہوں تم جو مانگو گی دوں گی"۔ زریں نے مستحکم لہجہ میں کہا۔

"زریں تم پنٹو کو ہمیں دیدو۔ ہم اسے اپنا بیٹا بنائیں گے۔ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھیں گے"۔

نجمہ کی بات سن کر زریں چپ ہوگئی۔ اچانک نجمہ اس سے لپٹ کر سسک اٹھی۔

"زریں یقین مانو پنٹو کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی"

"کیا اشعر صاحب بھی یہی چاہتے ہیں نجمہ ــ؟"

"ہاں! ..... میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ ہم اپنی ساری دولت و املاک پنٹو کے نام کر دیں گے"۔ اشعر نے کہا۔ "آپ جس طرح چاہیں قانونی پختگی کرالیں"۔

"اشعر صاحب! یہ دولت و ثروت آپ کو مبارک ہو۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ پنٹو کو اپنا نام دیدیجئے۔ اس کے باپ نے اسے اپنا نام دینے سے انکار کردیا ہے۔ جس کے بغیر اس کا وجود ادھورا اور نامکمل ہے۔ آپ اپنے نام سے اس کی تکمیل کردیجئے۔ میں چاہتی ہوں کہ پنٹو آپ کے زیر سایہ ہی پرورش پائے۔ لیکن میری آپ سے بس اتنی التجا ہے کہ آپ اس کی ولدیت کے خانے کو اپنے نام سے پر کردیجئے"۔

زریں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اس نے درمیانی پردہ ہٹا کر پنٹو کو اشعر کی گود میں دیدیا۔

اشعر دم بخود سے پنٹو کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔

زریں ان کے سامنے تھی۔ وہی زریں جس کو وہ زرینہ کے روپ میں بے سہارا چھوڑ آئے تھے۔

"زرینہ! میں نے عادل بن کر قدرت کے اس انمول تحفے کو ٹھکرانے کا گناہ کیا تھا۔ لیکن آج میں تمہارے اور نجمہ کے سامنے اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ پنٹو میرا ہی خون ہے۔ میرے ہی جگر کا ٹکڑا ہے۔ اور میری ہی آنکھوں کا نور ہے۔"

نجمہ حیرت اور مسرت سے یہ سب دیکھ اور سن رہی تھی اشعر کی بات ختم ہوئی تو اس نے آگے بڑھ کر پنٹو کو گود میں لے لیا۔ اور اسکا منھ چومتی ہوئی باہر چلی گئی۔

اشعر بے اختیار زریں کے سامنے جھک گئے۔

"مجھے معاف کردو زرینہ — میں تمہارا اور پنٹو دونوں کا گناہ گار ہوں۔"

زریں ان کے پیروں سے لپٹ کر سسک اٹھی اس نے اشعر کو معاف کر دیا تھا۔

بوجھ

بانو کالج سے واپس آئی تو گھر میں کافی چہل پہل تھی۔ امی جو کئی دن سے بخار میں مبتلا تھیں اس وقت بے حد مصروف نظر آرہی تھیں۔ ابو بھی جو عموماً گھٹنوں کے درد سے پریشان رہتے تھے اور ان کا زیادہ وقت اپنے کمرے ہی میں گذرتا تھا، اپنی چاندی کی موٹھ والی چھڑی کے سہارے اندر سے باہر کئی چکر لگا رہے تھے۔ ملازم لڑکے منا کی جان بھی عذاب میں تھی۔ وہ بیک وقت امی، ابو اور اس کی بہن شبو کے احکامات کی تعمیل میں قاصر نظر آرہا تھا۔

سارا گھر اجلا اجلا سجا سجایا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ مہمان آنے والے ہیں۔ بانو نے سوچا "پتہ نہیں کون آرہا ہے......؟ اور وہ اپنے کمرے میں جاکر لباس تبدیل کرنے لگی۔

منہ ہاتھ دھوکر وہ باہر نکلی، اور امی کے قریب ہی برآمدہ میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر دراز ہوگئی امی نے اسے بڑی شفقت سے دیکھا اور پیار بھرے لہجہ میں بولیں۔ "آج بہت تھکی ہوئی نظر آرہی ہو۔ کیا کالج میں کام زیادہ تھا"——؟

"جی ہاں امی! کالج میں انسپکشن ہونے والا ہے، اس کی تیاریوں کے سلسلے میں دیر ہوگئی"

ملازمہ چائے لیکر آگئی، بانو نے بے دلی سے چائے کا کپ ہاتھ میں لے لیا۔ اور آہستہ آہستہ پینے لگی۔ امی مسلسل کام میں مصروف تھیں۔ وہ الجھی الجھی سی یہ سارے انتظامات دیکھتی رہی۔ جب اس سے نہ رہا گیا تو پوچھ بیٹھی۔

"کون آرہا ہے امی!......؟

"بیٹی! بمبئی والے آرہے ہیں!" امی نے مختصر سا جواب دیا۔ بمبئی والوں کے نام پر وہ جیسے چونک پڑی۔ گذشتہ کچھ دنوں سے گھر میں بمبئی والوں کا ذکر زور و شور سے سننے میں آرہا تھا اور اس ساری افراتفری کا تعلق اس کی ذات سے تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنی سادہ لوح اور بھولی امی سے کہدے کہ فضول پریشان نہ ہوں۔ ایسے تماشے تو کئی بار ہو چکے ہیں۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی

منھ اُٹھائے چلا آرہا ہے۔ جیسے وہ شریف خاندان کی غیرت مند اور خود دار لڑکی نہیں بکاؤ چیز ہے۔ ابھی پچھلے مہینے اسکی خالہ امی کوئی رشتہ لائی تھیں۔ وہ لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ ان کے کئی پھیرے ہوگئے۔ اور فضول میں کافی پیسے ان کی خاطر مدارات میں خرچ ہوگئے۔ رشتہ ٹھہرانے والی بوا تو روز ہی نازل ہو جاتیں۔ ناشتہ، کھانا اور پان تمباکو کے علاوہ امی انھیں دو چار روپیہ کرایہ کے نام پر بھی ہر بار دیا کرتی تھیں۔ حالانکہ ان کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ بوا سارے جہان میں جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔ اور ان کا ذریعہ معاش ہی یہی ہے کہ شادی بیاہ کے نام پر ضرورت مند والدین کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کریں۔ سب سے زیادہ شامت لڑکی والوں کی آتی ہے کیونکہ وہ لوگ نسبتاً زیادہ غرض مند ہوتے ہیں۔

متعدد بار امی اور ابو نے لڑکے والوں کے استقبال کی تیاریاں کیں۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر ان کی تواضع کی، لیکن نتیجہ بے سود رہا۔ کبھی تو صاف انکار کر دیا گیا۔ اور زیادہ تر تو شرائط اور مطالبات کی اتنی بھرمار ہوتی تھی کہ سب لوگ خود ہی چپ سادھ لینے پر مجبور ہو جاتے۔

یہ لامتناہی سلسلہ اس کے انٹر پاس کرنے کے بعد شروع ہوا تھا۔ اور اب وہ ایم۔اے کرنے کے بعد ایک کالج میں لکچرر ہو گئی تھی۔ آئے دن کے یہ ڈھکوسلے دیکھ کر اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے والدین کو سمجھا دے ...... پھر یہ کہ وہ ان پر بوجھ نہیں تھی۔ آٹھ نو سو روپیہ ماہوار پیدا کرتی تھی۔ عزت تھی، ہر دلعزیزی تھی، شادی کر کے اس کو اس سے زیادہ اور کیا ملتا ہے؟ لیکن ....! والدین کی لگن اور تڑپ دیکھ کر اس کا دل اندر سے کڑھنے لگتا تھا۔ اور وہ ان کے روبرو زبان کھول کر انھیں مزید تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی تھی اور خاموشی سے یہ سارا تماشہ دیکھتی رہتی تھی۔ اگر بات صرف تماشہ تک رہتی تو بھی غنیمت تھا۔ لیکن جب ان ساری گہما گہمیوں اور تیاریوں کے بعد وہ اپنے والدین کے اترے ہوئے چہرے دیکھتی —— تو اسے ان رسموں اور فرسودہ روایات سے حد درجہ نفرت ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات تو اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کچھ کھا کر ابدی نیند سو جائے۔ اپنی اور اپنے والدین کی یہ توہین اسے خون کے آنسو رلا دیتی تھی۔

وہ ترقی پسند دور کی ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی تھی۔ لیکن جب کھلے بندوں اس کی قیمت لگائی جاتی تو وہ خود کو غلام زمانے کی کمتر ہستی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی۔

"بانو بیٹی! ذرا نہا دھو کر قاعدے کا لباس پہن لو۔ وہ لوگ بھی آتے ہی ہوں گے۔" بانو امی کی غیر متوقع بات سن کر چونک اٹھی۔ اس کے خیالات کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ پھر ان کی بات سمجھ میں آئی تو آہستگی سے بولی۔

"کیا مجھے ان کے سامنے جانا ہوگا۔؟"

"ہاں بیٹی! ان لوگوں کی یہی ضد ہے۔" امی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا ـــــ اب تک تو یہی ہوتا رہا تھا کہ، لڑکے والے آئے ...... کھایا پیا اور پھر الٹی سیدھی شرائط اور بے تکے مطالبات ہمارے سامنے رکھ کر چلتے بنے۔ لیکن اس بار تو حد ہی ہو گئی تھی۔ اب تو سچ مچ وہ تماشہ بنے گی۔

اسے پہلی بار اپنی امی پر غصہ آیا ـــــ آخر وہ ایک ذمہ دار اور خوددار ماں کی سطح سے نیچے کیوں گر گئی ہیں ـــــ؟ حالات سے ہار مان کر کسی کی بیہودہ شرطیں مان لینا کتنی غلط بات ہے شرائط پیش کرنے والے کل اور زیادہ غلط اور ناجائز مطالبات رکھ سکتے ہیں ـــــ تو ـــــ کیا ـــــ تو کیا ـــــ اب لڑکی والے اس حد تک گر جائیں گے کہ لڑکی کی عزت کا بھی سودا کر لیں۔؟ یہ اسکی عزت اور غیرت کا سودا ہی تو ہوا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے جائے ...... اور وہ اسے بازار کی ایک عام بکاؤ جنس کی مانند دیکھیں بھالیں .... پرکھیں اور اس میں اچھائیاں اور برائیاں ٹٹولیں۔ اور اس پر رائے زنی کریں ـــــ؟ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہرگز ان کے سامنے نہیں جائے گی۔ امی نے اصرار کیا تب بھی وہ صاف انکار کر دیگی۔ خواہ وہ ساری عمر کنواری ہی کیوں نہ رہے۔ لیکن وہ کسی کی بیہودہ شرط نہیں مانے گی آخر اس کی بھی تو کوئی پوزیشن ہے!

اسی وقت ابو اندر آتے دکھائی دیئے۔ بیماری کے پے در پے حملوں سے کچلا ہوا خمیدہ جسم، دھندھلی رنگت، بے نور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے۔ چوڑی پیشانی پر ان گنت شکنیں ابھری ہوئی۔ تو کیا ...... ابو کی اس حالت کی ذمہ دار وہ خود ہے ـــــ؟ ـــــ اور وہ اس کی ذمہ داریوں کے بوجھ تلے کچلے جا رہے ہیں ....؟ اگر ان کی یہ فکر دور نہ ہوئی تو ـــــ؟

بانو کے دل میں اپنے والدین کے لئے ہمدردی اور محبت کے بیکراں جذبات ابھر آئے۔ وہ سارے باغیانہ خیالات کو پیچھے دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور امی کی خواہش کے مطابق لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔

اپنے گندمی رنگ کی مناسبت سے اس نے ہلکے پیازی رنگ کا غرارہ کا سوٹ زیب تن کیا۔ جس پر سلمہ ستارہ کا نفیس کام بنا ہوا تھا۔ زیور کا ہلکا سا جڑاؤ سیٹ بھی پہنا۔ اور ہلکا سا میک اپ بھی کیا۔ امی اسے دیکھ کر خاصی مطمئن نظر آرہی تھیں .... جیسے انھیں یقین ہو کہ بمبئی والے ان کی بیٹی کو ضرور پسند کرلیں گے۔

امی نے مہمانوں کا بڑی خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ اور وسیع وعریض دسترخوان پر بہترین لوازمات سے ان کی خاطر تواضع کی۔ جسے ان لوگوں نے اپنا حق سمجھ کر قبول کیا۔ ناشتہ ختم ہوا تو دسترخوان پر مٹھائی اور نمکین بسکٹوں کے ریزے اور پھلوں کے چھلکے اپنی حالت پر گریہ کناں نظر آرہے تھے۔ واقعی ان پر زبردست یلغار ہوئی تھی۔

نقرئی ورقوں میں لپٹی ہوئی پان کی گلوریاں کلّوں میں دبا کر خواتین اطمینان سے بیٹھیں تو انھیں بیچاری لڑکی کا بھی خیال آیا۔ جسے وہ اپنے کھانے پینے کی مصروفیت میں بالکل بھول ہی گئی تھیں۔ لڑکے کی بھاوج جو اپنے تن و توش میں گوشت کا پہاڑ نظر آرہی تھیں۔ اس کی امی سے بولیں۔

"بہن! کیا ہم آپکی لڑکی کو دیکھ سکتے ہیں"۔؟

"جی ...... جی ہاں ..... جی ہاں ضرور دیکھئے۔ جیسی میری لڑکی ویسی ہی آپکی۔ آیئے میں آپکو وہاں لئے چلتی ہوں"۔

امی اس کمرہ میں آئیں۔ جہاں بانو بیٹھی ہوئی تھی۔ شبو بھی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اسکو اپنی جانب میں سنوار رہی تھی۔ امی نے بانو کو ذرا ٹھیک سے بیٹھنے کی تلقین کی۔ اپنے ہاتھوں سے اسکے سر پر دوپٹے کا آنچل برابر کر کے پیشانی تک گھونگھٹ کھینچ دیا۔ اور پھر مہمانوں کو لینے چلی گئیں۔

امتحان کے کمرے میں جو حالت طالب علم کی ہوتی ہے۔ بالکل وہی کیفیت بانو کی تھی۔ مارے شرم کے اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

عورتوں اور بچوں کی پوری ایک فوج اسے دیکھنے کیلئے ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ جیسے وہ گوشت پوست کی عام لڑکی نہ ہو۔ بلکہ عجائب گھر کی کوئی عجیب وغریب مخلوق ہو۔ یا کوئی انوکھا۔ اور دلچسپ تماشہ ہو۔ جو بس کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہو۔ اسے سخت ذہنی اذیت ہو رہی تھی کہ ...... اس نے امی کی بات کیوں

مان لی ـــــ کم ازکم اس طرح اسکی نمائش تو نہ ہوتی ۔ معائنہ کا وقت ختم ہوا تو اسکی جان میں جان آئی ۔ اور لڑکے کی بھاوج جاتے جاتے امی کا شکریہ ادا کر کے ذرا سی امید یہ بھی بندھا گئیں کہ وہ بہت جلد جواب دیں گی ۔

امی اس بار اتنی پر یقین تھیں کہ انھوں نے فوراً ہی ادھورے جہیز کی تکمیل میں رات دن ایک کرنا شروع کر دیا ۔ اور بے چارے ابو اپنے پیروں کا درد بھول کر بازار کے چکر لگانے لگے ۔ دونوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی ۔

مشکل سے ایک ہفتہ ہی گذرا ہو گا کہ لڑکے کی بھاوج اور خالہ مع چھ عدد بچوں کے اچانک ہی آدھمکیں ـــــ امی نے جلدی جلدی ان بن بلائے مہمانوں کے ناشتے پانی کا انتظام کیا ۔ بانو بھی برابر والے کمرے میں بیٹھی ہوئی ان سب کی چاؤں چاؤں سن رہی تھی ـــــ لڑکے کی بھاوج نے کہا.....

"دیکھئے بہن ۔ آپ کی لڑکی ہمیں پسند ہے ۔ بس ہمارے دیور کی شرط کے مطابق اتنی کمی ہے کہ رنگ ذرا دبتا ہوا ہے ۔ انھیں گورا رنگ پسند ہے ۔ لیکن خیر ہم ان کو سمجھا لیں گے ۔ اور جیسے تیسے راضی کر لیں گے ۔

ان کی اس بات کا امی کیا جواب دیتیں ۔ بے چاری خاموش رہیں ۔ "بس ایک بات کا آپ کو خود خیال رکھنا ہو گا کہ زمانے کے مطابق جہیز کا سامان ہو ۔ تو لڑکا خوش ہو جائیگا ۔ ویسے وہ ہے تو کافی ضدی خدا نہ کرے کہ کسی بات پر اڑ جائے ۔ لیکن خیر !! اسے سمجھانا ہمارا ذمہ رہا" ـــــ امی کی زبان گنگ رہی ۔ بھاوج ہی ٹیپ ریکارڈ کی طرح بولتی رہیں ۔

"اب تو جہاں دیکھئے ۔ فرج اور ٹیلیویژن کے بغیر جہیز گویا مکمل ہی نہیں ہوتا ۔ پھر یہ تو عام چیزیں ہیں سچ تو یہ ہے کہ اب ان کے بغیر کام نہیں چلتا ۔ سب سے بڑھ کر لڑکے کی شخصیت کا بھی سوال پیدا ہوتا ہے ۔ دوستوں اور عزیزوں کے سامنے جہیز آئے گا ۔ تو ان چیزوں کے بغیر اس کی کتنی توہین ہوگی ......
ارے بی بی ۔ اب تو لڑکے ان چیزوں کے بغیر لڑکی کو قبول کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے ۔" خالہ جان نے لقمہ دیا ۔ "میں نے اسکوٹر کے لئے کہلوایا تھا" ۔ امی نے دبی زبان میں کہا ۔

"جی ہاں ..... وہ تو میں نے لڑکے کو بتا دیا ہے ۔" "تو کیا اسکوٹر کے بعد بھی ان کی ضد ٹی وی اور فرج کیلئے ہے ؟ دراصل ہم اسکوٹر خرید چکے ہیں ۔ ورنہ ان کی فرمائش کے مطابق ٹی ۔ وی اور فرج

ہی دیدیتے ۔..... ''بہن ! آپ یہ تو سوچئے کہ ہمارا دیور انجینئر ہے انجینئر۔ اسکے لئے تو نہ جانے کتنے اچھے اچھے رشتے آرہے ہیں۔ لیکن ہم نے سوچا کہ جب شادی ہی کرنا ہے تو آپ ہی کے ہاں کیوں نہ کریں ——— ؟''

بھاوج نے گویا احسان جتاتے ہوئے کہا۔ امی بے چاری خاموش رہیں۔ شاید یہ احسان اتنا بڑا تھا کہ اس کے بوجھ سے وہ بالکل ہی دب گئیں۔ لیکن بانو سے یہ برداشت نہ ہوا۔ وہ اتنی دیر سے بیٹھی کھول رہی تھی۔ بار بار وہ اپنے ہونٹ چباتی۔ اب جو بھاوج کے احسان نے امی کو لاجواب کر دیا تو وہ مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گئی۔

دروازے کا پردہ ہٹا کر وہ اس جگہ آ گئی جہاں سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ امی نے جلدی سے بانو کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اور اس کے تیور دیکھ کر وہ سٹپٹا گئیں۔ اور اسکو روکنے کیلئے آگے بڑھیں تو بانو نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر لڑکے کی بھاوج سے مخاطب ہو کر بولی :۔

''معاف کیجئے گا! ہم نے ٹی۔ وی اور فرج کی ایجنسی نہیں کھولی ہے۔ آپ تشریف لیجائیے ہم آپکی اور آپکے دیور کی یہ بیہودہ مانگیں پوری کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں''۔

بھاوج حق دق اس کی شکل دیکھنے لگیں۔ خالہ جان کی انگلی ''ادئی'' کے انداز میں ناک پر چلی گئی۔ لیکن اس نے ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ اور امی کا ہاتھ تھام کر وہاں سے چلی گئی۔ امی اسکے گلے سے لپٹ کر رونے لگیں تو وہ اسکو سمجھانے لگی۔

''آپ ذرا یہ تو سوچئے کہ جو مرد ہر قسم کی ضروریات زندگی کیلئے میرا ہی محتاج ہو۔ اس کے ساتھ پہاڑ جیسی زندگی کیسے گذرے گی۔؟ اتنا کمزور مرد ——— جو عورت کا سہارا ڈھونڈے۔ کسی طرح بھی کامیاب شوہر نہیں ہو سکتا۔ ایسے کمزور انسان کے لئے آپ رنجیدہ کیوں ہوتی ہیں۔؟ ہمیں تو ایسے شوہر کی ضرورت ہے جو زندگی کی تپتی صحرا میں ٹھنڈی چھاؤں بن سکے۔ آئندہ ایسا موقع آیا تو شرائط ہماری ہوں گی۔

اور امی نے جھک کر اسکی پیشانی چوم لی۔

نیا سورج

کلثوم نے پانچویں بار دروازہ کی جھری کھول کر جھانکا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ دور تک کسی عام آدمی کا پتہ نہیں تھا۔ البتہ بند دو کانوں کے پٹڑوں پر اور لب سڑک بنے ہوئے مکانوں کے برآمدوں میں پولیس کے نوجوان اپنی بندوقیں سنبھالے ہوئے بیٹھے تھے۔ چند منٹ قبل ہی پولیس کی گاڑی کرفیو کا اعلان کرتی گذر چکی تھی۔ اور اب سڑک ایسی سنسان پڑی تھی جیسے کسی بیوہ کی اجڑی مانگ ہو۔ لیکن... رشیدے کا اب تک پتہ نہیں تھا۔ وہ اسکے لئے بہت پریشان تھی۔ شہر میں فساد کا آج چھٹا دن تھا ایک ہی ملک کے رہنے والے اور ایک ہی دھرتی پر جنم لینے والے آج ایک دوسرے کے خون کے ...... پیاسے ہو رہے تھے۔ گنگا اور جمنا، گومتی اور گھاگرا کا شفاف پانی آج دونوں کے خون سے لال ہو رہا تھا۔

قصور کس کا تھا ———— ؟

انھیں لوگوں کا جن کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ دھرم۔ جن کا ایمان تو بس پیسہ ہوتا ہے۔ اور سماج کے کچھ ٹھیکیداروں نے امن و سلامتی غارت کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اور سماج کے یہ ٹھیکیدار بڑی بڑی رقمیں دیکر ان غنڈوں کو خرید لیتے ہیں اور پھر وہی ہوتا ہے۔ جو یہ چاہتے ہیں۔ قتل و غارت گری۔ آتشزنی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ بے گناہ اور بے قصور لوگ مرتے ہیں، گرفتار ہوتے ہیں۔ ان پر مقدمے چلائے جاتے ہیں ———— اور قصوروار ———— قاتل اور غنڈے اپنی پناہ گاہوں میں چھپے ———— اگلے جرم کے منصوبے بناتے ہیں۔

شروع میں تین دن تو چوبیس گھنٹے کا کرفیو لگا رہا۔ کیونکہ حالات بہت خراب تھے اور لوگ پولیس پر بھی بھروسہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ انتظامیہ کے اوپر سے ان کا بھروسہ اٹھ چکا تھا۔ اس لئے سب لوگ خود کو گھروں کے اندر ہی محفوظ سمجھ رہے تھے، لیکن وہ لوگ جو مزدور پیشہ تھے۔ جنھیں روز کنواں کھودنا اور پانی پینا پڑتا تھا..... فاقے کرنے لگے

کلثوم کا ہاتھ بھی تنگ تھا۔ دو تین دن تو رکھا دھرا پکا کر بچوں کو کھلایا۔ چوتھے دن فاقے کی نوبت آگئی اس لئے جیسے ہی چند گھنٹے کے لئے کرفیو کھلنے کا اعلان ہوا۔ رشیدے پیسے اور جنس کے انتظام کے لئے نکل گیا۔ کلثوم نے اسے تاکید کر دی تھی کہ جلدی آجائے۔ رشیدے اس روز دکانداروں سے پیسے وصول کر کے اور کھانے پینے کا سامان لے کر جلد ہی آبھی گیا۔ لیکن جب کرفیو میں مزید نرمی ہوئی اور صبح و شام دو دو گھنٹے کے لئے کرفیو ہٹنے لگا تو وہ ان اوقات میں دوکان داروں کو سامان پہنچانے لگا۔ آج صبح بھی وہ ماں سے کہہ کر گیا تھا کہ جلد ہی آجائے گا اور کرفیو کے پہلے گھر پہنچ جائیگا۔ لیکن اب تو کرفیو لگنے کا اعلان بھی ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک لاپتہ تھا کلثوم کے دل میں برے برے خیالات آرہے تھے۔ وہ اندر سے باہر اور باہر سے اندر تک بولائی بولائی گھوم رہی تھی ۔ اسکی گھبراہٹ فطری بات تھی۔ کیونکہ رشیدے کا باپ چند سال قبل ایک فساد ہی میں مارا گیا تھا۔ وہ ہنس مکھ اور نیک آدمی تھا۔ سر پر بڑی سی پیٹی اٹھائے۔ محلہ محلہ اور گھر گھر گھوم کر بسکٹ اور کیک وغیرہ فروخت کرتا تھا۔ بچے اس سے اتنے مانوس تھے کہ اس کے منتظر رہتے تھے ۔ اور اس کی آواز سنتے ہی دوڑ پڑتے تھے۔

بابا بسکٹ، بابا کریم رول، بابا کیک کی صداؤں سے ماحول گونج اٹھتا تھا۔ اور رمضو بابا کسی کو پیار کرتا کسی کو گود میں اٹھالیتا۔ کسی کا گال چھوتا۔ اور اگر دیکھتا کہ کوئی بچہ چپ چاپ کھڑا ہے تو سمجھ جاتا کہ آج ماں نے پیسے نہیں دیئے راجہ جی کو۔ اور وہ اسے پیار کر کے بسکٹ پکڑا دیتا۔ محلے کی بہوؤں اور بیٹیوں سے ان کی خیریت دریافت کرتا۔ پیسے نہ ہوتے تو ادھار ہی دیدیتا لیکن یہی رمضو بابا جب ایک بار فساد کے بعد حسب معمول اپنی پیٹی لیکر نکلا۔ تو صبح کا گیا شام تک واپس نہ آیا۔ اور پھر ایک آدمی نے آکر بتایا کہ رمضو مار ڈالا گیا۔ ــــــ وہ جو سارے ہندو اور مسلمان بچوں کا ــــــ بیٹوں اور بہوؤں کا "بابا" تھا ــــــ جس کا مذہب صرف پیار تھا ــــــ اسے کسی ظالم نے اتنے چاقو مارے کہ وہ ختم ہو گیا۔ بسکٹوں کی پیٹی اسکے قریب ہی اوندھی پڑی رہی۔ اور جب پولیس کے سپاہی وہ پیٹی لیکر کلثوم کے پاس آئے تو وہ اس سے لپٹ کر ایسے روئی جیسے رمضو کی نعش ہو۔

ــــــ پھر وقت گذرتا رہا ــــــ اور بڑے لڑکے رشیدے نے سارا گھر سنبھال لیا ــــــ صبح وہ اسکول پڑھنے جاتا تھا کہ اس کے بابا کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے اور اسکی طرح

پیٹی لیکر گلی، گلی نہ گھومے۔ اسکول سے واپس ہو کر وہ جلدی جلدی کھانا کھاتا۔ اور اپنی سائیکل کے کیریر میں پیٹی باندھ کر اور ہینڈل میں بڑے بڑے کنوس کے تھیلے لٹکا کر دوکانداروں اور ہوٹلوں پر مال پہنچاتا۔ اس کا کام اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ اس کی شرافت، شیریں بیانی، اور تعلیمی حیثیت نے اسے بڑا ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ سب لوگ اس سے خوش رہتے تھے۔ اس کو چاہتے تھے۔ اور بالخصوص بیکری کے مالک شری رام اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ رشیدے حساب کتاب میں بھی بڑا ایماندار تھا۔ اس لئے دوسرے لوگوں کی طرح اس سے حساب کتاب بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ خود ہی ان کا حساب صاف رکھتا تھا۔

کرفیو کی وجہ سے سارا دھندا ہی چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ چند گھنٹوں میں وہ بہت کم مال پہنچا پاتا تھا سب ہی محلے زیادہ تر کرفیو سے متاثر تھے۔ بیکری میں مال بھی زیادہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔ ہر سمت پریشانی کا دور دورہ تھا۔ وہ سکون واطمینان وہ چہل پہل اور رونق ——— اور سب سے بڑھ کر بھائی چارہ کی فضا ختم ہو گئی تھی۔ ہر سڑک سنسان ہر محلہ اجاڑ اور ہر بستی ویران نظر آتی تھی ——— جیسے یہ زندوں کی نہیں ——— مردوں کی بستی ہو۔ ہر چہرہ ہونق اور ہر صورت بے رونق نظر آ رہی تھی۔ آدمی اپنے سائے سے بھی خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ دوسرے پر بھروسہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مرد گھروں سے کام کاج کے لئے نکلتے تھے تو گھر میں عورتیں اسوقت تک ہولا کرتیں جب تک وہ صحیح سلامت واپس نہ آ جاتے۔ رشیدے بھی آج صبح سے گیا ہوا تھا اور اب شام ہو چکی تھی، کلثوم کے کان سائیکل کی گھنٹی پر لگے ہوئے تھے۔ اور رشیدے کا مخصوص جملہ بار بار اس کے کانوں میں گونج اٹھتا تھا ———

"اماں ذرا پیٹی تو سنبھالو"

کلثوم کے دل میں برے برے خیال آ رہے تھے۔ رشیدے کی بھولی بھالی صورت نظروں میں گھوم رہی تھی۔ دو ہی سال میں اس نے کتنا اچھا ڈیل ڈول نکالا تھا ——— عمر میں تو ابھی سترہ اٹھارہ برس ہی کا تھا۔ لیکن دیکھنے میں اکیس سال کا لگتا تھا۔ سیرت اسکی لاجواب تھی، اپنے باپ ہی کی طرح نیک اور شریف تھا۔ لیکن آج کل یہ سب کون دیکھتا ہے۔ اب تو انسان کو انسان کی حیثیت سے کوئی نہیں پہچانتا ——— رنگ ونسل سے پہچانتے ہیں۔ فرقہ پرستی اور تعصب نے سب کو اندھا

کر رکھا ہے۔ خدا جانے یہ دنیا کدھر جا رہی ہے ــــــ ؟ وہ محبت و پیار۔ وہ ایک دوسرے کے کام آنا اور ان پر جان چھڑکنے کا جذبہ کدھر چلا گیا۔ مل جل کر رہنے کا ڈھنگ سب کیوں بھول گئے۔ ؟

کلثوم کا دل پہلو سے نکلا جا رہا تھا۔ کرفیو نہ ہوتا تو وہ خود رشیدے کو ڈھونڈنے جاتی۔ لیکن مجبوری میں سوائے ہول کھانے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ ؟ اس نے چھوٹے بچوں کو کھلا پلا کر سلا دیا۔ اور خود رشیدے کے انتظار میں بھوکی پیاسی ساری رات جاگتی رہی۔ پتہ بھی کھڑکتا تو وہ چونک پڑتی۔ اور دعائیں مانگنے لگتی خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ سورج کی روشنی نے امیدوں کے چراغ روشن کر دیئے۔ دل کو ایک نئی توانائی بخشی۔ اور وہ گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ اس وقت پڑوسی نے اپنی چھت پر آ کر اسے بتایا کہ پرانے نخاس میں کل شام ایک نوجوان مار ڈالا گیا ــــــ پڑوسی کی بات سن کر تو کلثوم کی جان ہی نکل گئی رشیدے کو بھی تو اس محلے میں سامان دینا تھا۔ کیا رشیدے ـ ؟ اس کا رشیدے ـ ؟

ــــــ کلثوم کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ اسکی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ تیورا کر گرنے ہی والی تھی کہ دروازے پر سائیکل کی گھنٹی بجی ــــــ اور پھر رشیدے کی مخصوص آواز سنائی دی

"اماں! ذرا پیٹی تو سنبھالنا۔"

رشیدے کی آواز سن کر کلثوم کی روح اس کے جسم میں دوبارہ واپس آ گئی۔ دھندھلی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ــــــ اور وہ پھرتی سے دروازہ کی طرف لپکی ــــــ اور پیٹی تھام لی رشیدے سائیکل لے کر اندر آیا۔ سامان رکھ کر منھ ہاتھ دھوتے ہوئے وہ باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔

"کل شام لوٹنے میں دیر ہو گئی تو گھر نہیں آ سکا۔ کرفیو لگ گیا تھا ــــــ رات میں نے بیکری کے مالک شری رام جی کے گھر پر گذاری۔ کھانا بھی وہیں کھایا۔ اور آرام سے سویا بھی ــــــ صبح ہوئی تو مالک نے کہا کہ جلدی سے گھر جا۔ ماں پریشان ہو رہی ہوگی۔"

اور کلثوم سوچ رہی تھی کہ ـــ شری رام جی تو دوسرے فرقے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ برے نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر فرقے میں اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں ــــــ لیکن برائی وہ آگ ہے جو جلدی پھیلتی ہے۔ اور لپیٹ میں سب لوگ آ جاتے ہیں۔ اچھے لوگ ہر حال میں اچھے ہی رہتے ہیں اور اس آگ میں تپ کر وہ کندن بن جاتے ہیں۔ کاش ہر انسان کندن بنجائے۔ کلثوم سجدۂ شکر میں گر گئی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔ پروردگار! ہندو

مسلمان دونوں کو نیک توفیق دے۔ بھائی بھائی گلے مل کر گلے شکوے بھول جائیں ـــــــ تاکہ کسی ماں کی گود نہ اجڑے۔ کسی کا گھر سونا نہ ہو۔ اس میں سب کا سکھ ہے۔"

کلثوم نے سجدے سے سر اٹھایا۔ آج کا سورج ایک نیا پیغام لیکر آیا تھا ـــــــ لاؤڈ اسپیکر کی آواز گونج رہی تھی "کرفیو ختم کر دیا گیا ہے۔ شہر میں سکون ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ اور پہلے کی طرح اطمینان سے اپنا کام کریں۔"

سچ مچ ایک نیا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ جو کہ امن و آشتی کا ـــــــ محبت اور بھائی چارے کا پیغام لے کر آیا تھا۔

نشہ اور ٹھوکر

فرزانہ آفس سے واپس آئی تو ننھا بوبی اس کو باہر ہی کھیلتا ہوا مل گیا۔ ڈیڑھ سالہ بوبی جانے کب آیا کی نظر بچا کر باہر نکل آیا تھا۔ فرزانہ کو آیا پر بہت غصہ آیا۔ "کم بخت نہ جانے کس دھن میں رہتی ہے۔"

وہ غصے میں بھری ہوئی اندر گئی اور بوبی کو گود سے اتار کر آیا کو پکارا۔ آیا جھاڑن سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی آگئی۔

"تم کیا کرتی رہتی ہو آخر؟ بوبی باہر نکل گیا اور تم کو خبر ہی نہیں۔ اگر وہ سڑک پر چلا جاتا تو ——؟"

"میم صاحب! غلطی ہو گئی۔ میں تو بابا کو چند منٹ کیلئے چھوڑ کر باتھ روم گئی تھی۔ آپ کے اور صاحب کے آنے کا وقت تھا۔ اس لئے باہر کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ورنہ میں تو خود ہی دروازہ بند رکھتی ہوں۔"

آیا بہت شرمندہ تھی۔ فرزانہ مزید کچھ کہے کمرہ میں چلی گئی۔ لباس تبدیل کیا۔ گیس جلا کر چائے کا پانی رکھا اور خود منھ ہاتھ دھونے لگی۔ اجمل کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اگر آنے کے دس منٹ کے اندر اندر ان کو چائے نہیں ملتی تھی۔ تو وہ فوراً غصے میں باہر کا رخ کرتے تھے۔ اور ان کا موڈ کئی دن خراب رہتا تھا اس لئے فرزانہ آفس سے آتے ہی چائے کے انتظام میں لگ جاتی تھی۔ ننھا بوبی اس کو دیکھ کر پاس آنے کے لئے ضد کرنے لگتا تھا اور رونے لگتا تھا۔ لیکن اس کو تو اتنی بھی فرصت نہیں ملتی تھی کہ وہ ذرا دیر کے لئے اس کو گود میں اٹھالے یا پیار کر کے بہلالے۔

پاپڑ تلتے ہوئے اسے اجمل کی آمد کی اطلاع ملی۔ وہ بوبی کو پکار رہے تھے۔ فرزانہ نے چائے دم دی۔ ایک دن پہلے کی بنی ہوئی کھجوروں کو گھی میں دوبارہ گرم کیا۔ برآمدہ میں کھانے کی میز اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ناشتہ چائے وہیں لگا دیا۔ ذرا دیر میں اجمل مونہہ ہاتھ دھو کر وہیں آ گئے۔ فرزانہ نے چائے بنا کر ان کو دی۔ "آج آپ کو بڑی دیر ہو گئی۔" "ہاں کچھ تو ہو ہی گئی۔ نعیم، راکیش اور صفدر پکڑ کر لے گئے تھے۔" "اگر آپ کوشش کر کے سیدھے گھر آجایا کریں تو اچھا ہے۔ مجھے بس پکڑنے میں دیر ہو جاتی ہے تو بوبی اکیلا رہ جاتا ہے۔ آج وہ باہر نکل گیا تھا۔"

"آفس کے بعد دوست روک لیں تو میں ان سے یہ کہہ کر پیچھا تو چھڑانے سے رہا کہ مجھے جانے دو۔ گھر جاکر بچے کو دیکھنا ہے۔"

اجمل نے تلخ لہجے میں کہا۔ اور صرف دو کپ چائے کے پی کر کھڑے ہو گئے۔ ناشتے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ اندر جاکر لباس تبدیل کیا اور بغیر کچھ کہے سائیکل لے کر باہر نکل گئے۔ فرزانہ خاموشی سے انکو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ پھر دل پر اجمل کی خفگی کا بوجھ لئے رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ آیا بوبی کو لیکر باہر کے پارک میں گھمانے چلی گئی۔ صبح کا ناشتہ تیار کر کے فرزانہ آفس چلی جاتی تھی۔ کھانا آیا تیار کرتی تھی۔ اجمل کا ٹفن چپراسی آکر لے جاتا تھا۔ خود وہ ٹفن بھی لیکر نہیں جاتی تھی۔ لنچ ٹائم میں آفس کینٹین سے چائے منگا کر پی لیتی تھی۔ دو ایک سموسے یا بسکٹ کھا لیتی تھی۔ پانچ بجے جب وہ آفس سے نکلتی تھی تو بھوک اور تھکن سے بے حد نڈھال ہوتی اس کے باوجود اس کو آدھا گھنٹہ بس کے انتظار میں کھڑے ہو کر گذارنا پڑتا تھا۔ گھر آتی تو فوراً چائے کے انتظام میں لگ جاتی۔ اجمل کے ساتھ چائے پی کر پھر شام کے کھانے کا چکر شروع ہو جاتا۔ آیا بوبی کو لیکر اندھیرا پڑے گھر آتی تھی تب کہیں جاکر اسے فرصت ملتی تھی۔

ذرا دیر بوبی کو فیڈر کرانے میں مشغول رہتی پھر اس کو سلاتے سلاتے وہ خود بھی سو جاتی۔ اور رات کو اس وقت اٹھتی جب اجمل آکر اس کو جگاتے تھے۔ صبح پانچ بجے سے پھر کام کا چکر شروع ہو جاتا تھا دن بھر تھکنا اور رات کو مُردوں سے شرط بد کر سو رہنا یہ تکلیف دہ معمول صرف چار پانچ ماہ سے شروع ہوا تھا ورنہ اس سے پہلے اس کی زندگی بہت خوشگوار تھی ۔ سارا کام وہ خود کرتی تھی۔ بس ایک برتن اور فرش صاف کرنے آتی تھی ۔ وہ صبح سے شام تک گھر کا کام کرتی تھی۔ لیکن تھکن کا نام بھی نہ ہوتا۔ اب زیادہ کام آیا سنبھالے ہوئے تھی پھر بھی اس کا تھکن کے مارے برا حال رہتا تھا۔

فرزانہ کی پر سکون زندگی میں اچانک خار دار پودے اگ آئے تھے۔ کب۔؟ کیسے؟ یہ وہ سمجھ ہی نہ سکی۔ شائد اس میں تھوڑا بہت ہاتھ ان کے پڑوسیوں کا بھی تھا۔ ان کے پڑوس میں ستیش اور اسکی بیوی انجنا رہتے تھے۔ جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی سروس کرتے تھے ستیش انجنا کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر آفس چھوڑتا ہوا اپنے کام پر چلا جاتا۔ اور واپسی پر اسکو لیتا ہوا گھر آجاتا۔ ذرا دیر کے بعد وہ لوگ نہا دھو کر ناشتہ کر کے تیار ہو جاتے اور باہر نکل جاتے۔ واپسی رات کو دس گیارہ بجے تک ہوتی۔ ان کی غیر موجودگی میں آیا گھر کا کام کاج دیکھتی تھی۔ ان کا چھوٹا سا فلیٹ زندگی سے بھرپور

قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ ستیش کے پاس کئی بڑھیا بڑھیا سوٹ تھے اور انجنا بھی روز نئی نئی ساڑیاں بدلتی تھی۔ گھومنے کے لئے موٹر سائیکل تھی۔ جب کہ فرزانہ کے پاس گنی چنی ساڑیاں تھیں۔ اور اجمل کے پاس بھی بس کام چلاؤ سوٹ تھے۔ شروع مہینے میں کبھی ایک آدھ بار فلم کا یا گھومنے کا پروگرام بن جاتا تھا۔ ورنہ باقی سارا مہینہ ہی سوکھا گذر جاتا تھا۔ ان کا بجٹ روز روز کی سیر و تفریح کی اجازت نہیں دیتا تھا فرزانہ نے بہت سوچا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔؟ نتیجہ یہ نکلا کہ اجمل کے چار ساڑھے چار سو کی آمدنی زندگی گذارنے کے لئے بہت کم ہے اسی لئے یہ ساری تکلیفیں ہیں۔ اگر وہ بھی سروس کرلے تو سارا دلدّر دور ہوجائیگا۔ وہ گریجویٹ ہے جاہل نہیں ہے۔ ڈھائی تین سو روپئے کی سروس مل ہی جائے گی آخر ایک دن اس نے اپنی خواہش کا اظہار اجمل سے کر ہی دیا جسے سن کر اجمل نے سخت مخالفت کی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن سچ پوچھو تو آئی گئی کہاں ہوئی ـــ؟ بات تو دراصل اب شروع ہوئی تھی۔ فرزانہ کو اپنی تکلیفوں کا احساس زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا۔ وہی باتیں جن کو وہ معمول سمجھ کر نظر انداز کردیتی تھی۔ اب چوبیس گھنٹے اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے اپنی محرومی اور بدقسمتی کا خیال تڑپانے لگا۔ راہ چلتی عورتوں کی خوبصورت ساڑیاں۔ نوٹوں سے بھرے پرس۔ چمکتی کاریں اور زن ـــ زن کرکے جاتے ہوئے اسکوٹر اس کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ گول مٹول، پیارے پیارے بچے جب شام کو اپنی آیاؤں کے ساتھ گاڑیوں میں گھومنے نکلتے تو ان کے نئے نئے خوش رنگ سوٹ دیکھ کر وہ اپنے بوبی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگتی ـــــــ اور سوچتی! اے خدا کب ہماری مصیبتیں دور ہونگی۔

ستیش اور انجنا کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی انھوں نے ان کو بھی مدعو کیا تھا۔ فرزانہ نے سوچا کہ سالگرہ میں ابھی کئی دن باقی ہیں۔ تنخواہ پر وہ اپنے لئے ایک نئی ساڑی ضرور لے آئیگی۔ لیکن جب تنخواہ ملی تو حساب کتاب کرنے کے بعد اس میں ساڑی کی گنجائش ہی نہیں نکلی۔ وہ اجمل سے الجھ پڑی۔ "آئندہ مہینے لے لینا ساڑی۔ اس میں غصے کی کیا بات ہے۔ بوبی بیمار پڑ گیا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر کے بلوں نے بجٹ فیل کردیا۔" اجمل نے اسے ڈھارس بندھائی۔

"ہر مہینے کوئی نہ کوئی بات نکل آتی ہے۔ وہ تو میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ آپ کی تنخواہ میں کبھی ایک ساڑی تک نہیں خرید سکتی۔ اب انجنا کے ہاں کیا پہن کر جاؤں گی۔؟"

وہ روہانسی ہوگئی۔

"پہلے کی اتنی ساڑیاں رکھی ہیں۔ ان میں سے کوئی پہن لینا۔"

"آخر کب تک —— بار بار وہی ساڑیاں پہنوں۔ اب تو ان کو پہن پہن کر دل اوب گیا ہے۔ انجنا کو دیکھئے۔ روز ایک سے ایک نئی اور قیمتی ساڑی پہنتی ہے۔ ایک میں ہوں کہ کسی تقریب کے لئے بھی کوئی ساڑی نہیں لے سکتی۔ اگر سروس کرنے کے لئے کہتی ہوں تو آپ کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ ننگی بوچی گھوموں —— تو عزت بڑھتی ہے۔"

فرزانہ اس دن اچھی طرح اجمل سے الجھی۔ آخر روز روز کی ہائے ہائے سے پریشان ہو کر اجمل نے اسے سروس کرنے کی اجازت دے دی۔ جلد ہی فرزانہ کو ایک آفس میں تین سو روپئے کی سروس مل گئی۔

سروس کرتے ہی اخراجات نے ایک لمبی جست لگائی۔ بظاہر ہر چیز ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مثلاً آفس جانے کیلئے کئی اچھی ساڑیاں بے حد ضروری تھیں۔ نئے نئے سینڈل، پرس اور تھوڑا بہت میک اپ کا سامان اور خوشبوئیں وغیرہ۔ پھر اس کے آفس جانے کے بعد گھر کا اور بوبی کا کیا ہوگا؟ اس لئے چالیس روپئے ماہوار اور کھانے پر ایک آیا رکھی گئی جو زمانہ کو دیکھتے ہوئے بے حد سستی مل گئی تھی —— انجنا تو اپنی آیا کو ساٹھ روپئے ماہوار دیتی تھی۔ آیا کی وجہ سے فرزانہ کا کام بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ سارے دن آیا بوبی کو بھی دیکھتی تھی اور گھر کا کام بھی کرتی تھی۔ فرش صاف کرنے والی ماما الگ تھی۔ نئی نئی سروس تھی اس لئے وہ اپنے ساتھ کی لڑکیوں کو اکثر چائے اور سنیما کے لئے بھی مدعو کر لیتی تھی۔ آخر کچھ اپنے بڑے پن اور امارت کا رعب بھی ڈالنا تھا۔ اس لئے اسے دنیا داری برتنا پڑتی تھی۔ اسکی سہیلیاں بھی تو اسے اپنے ہر پروگرام میں شامل کرتی تھیں۔ ملنے جلنے کا دائرہ وسیع ہوا تو اس کو روز روز تقریبوں میں بھی بلایا جانے لگا۔ کبھی کسی سہیلی کی سالگرہ، کبھی ان کے بھائی بہن کی منگنی وغیرہ۔ اب کسی تقریب میں بغیر تحفے کے جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لانڈری کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ آفس جانے کی وجہ سے فرزانہ کو گھنٹوں چولہا پھونکنے کی فرصت نہیں تھی اس لئے گیس اور کوکر بھی لینا پڑا۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اجمل کو اسکوٹر خریدنے کے لئے زور دیا۔ اسکوٹر قسطوں پر خریدا گیا جو ایک دن حضرت گنج سے چوری ہو گیا لیکن قسطوں کی ادائیگی ابھی جاری تھی۔ اس کے علاوہ پروگرام میں کچھ ایسی الٹ پھیر ہوئی کہ گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ناشتے، کھانے، سونے، بیٹھنے اور آنے جانے میں خاصی گڑبڑ ہونے لگی۔ اجمل اور ننھا بوبی تو جیسے فرزانہ کے پیار کے لئے ترس ترس گئے۔ اپنے شوہر اور بچوں کے لئے اسکے پاس وقت ہی کہاں

تھا؟ - کبھی اجمل رات کو لوٹتے تو ان کا دل چاہتا کہ فرزانہ پہلے ہی کی طرح نیند میں ڈوبی، متوالی آنکھوں.. میں پیار بھر کر اس کا مسکراتے ہوئے استقبال کرے - دیر میں آنے کا شکوہ کرے - روٹھنے کی اداکاری کرے - لیکن یہ سب تو محض خواب کی باتیں تھیں -

اجمل گھر واپس آتا ـــــــ تو فرزانہ سوتی ہوئی ملتی - وہ اس کو جگاتا - تو بے دلی سے دو چار لقمے کھا کر تھکن اور نیند کا عذر پیش کر کے سو رہتی - وہ چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتا تو ہوں - ہاں میں جواب دے کر وہ نیند کی آغوش میں چلی جاتی - کبھی آفس سے واپس آ کر وہ اسے سیر و تفریح کے لئے لے جانا چاہتا تو کام کا عذر پیش کر کے جانے سے انکار کر دیتی - اتوار کو تو ویسے بھی اسے دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی تھی - ہفتہ بھر کی پہنی ہوئی ساڑیوں کو دھونا - استری کرنا، گھر کی صفائی، کپڑوں کی مرمت وغیرہ - پچاسوں کام نکل آتے - کبھی کوئی سہیلی آدھمکتی تو کبھی خود اسی کو اپنے یہاں گھسیٹ لے جاتی - غرض زندگی ایک مشین بن کر رہ گئی تھی - ہر بار اجمل سوچتے کہ اب کی بار وہ ضرور فرزانہ کو سروس پر جانے سے روک دیں گے لیکن فرزانہ اس کا موقع ہی نہیں دیتی تھی - وہ پہلی تاریخ آنے سے پہلے ہی خریداری کا پروگرام بنا لیتی تھی پھر تنخواہ ملتی تو آفس ہی سے بازار چلی جاتی - اور پھر پیکٹوں سے لدی پھندی گھر آتی ـــــــ آدھی تنخواہ دکانداروں کی نذر ہو جاتی جس کا اسے مطلق غم نہ ہوتا - آخر اسی لئے تو اس نے ملازمت کی تھی -

ننھا بوبی اب ڈیڑھ سال کا ہو چکا تھا - اور سارے گھر میں منڈلاتا پھرتا تھا - ادھر ادھر آتے جاتے وہ اکثر چوٹ کھا جاتا تھا - کئی بار وہ زینے پر سے لڑھکا - دہلیز پار کرنے اور بستر سے نیچے اترنے کی کوشش میں بھی وہ کئی دفعہ چوٹ کھا چکا تھا - چلنے پھرنے والے بچے کی دیکھ بھال کا کام زیادہ بڑھ جاتا ہے - ویسے تو آیا زیادہ تر باہر کا دروازہ بند ہی رکھتی تھی - لیکن کسی آنے جانے والے کے لئے تو بہر حال دروازہ کھولنا ہی پڑتا تھا - ادھر آیا کسی کام میں مصروف ہوئی اور ادھر بوبی جلدی سے باہر، پھر دن بھر کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا تھا - کبھی دودھ والا، کبھی اخبار والا، کبھی دھوبی اور کبھی جھاڑ پونچھ کرنے والی مائی - اب بیچاری آیا کہاں تک آنے جانے والوں اور بوبی کا بیک وقت دھیان رکھ سکتی تھی -

شب و روز انھیں پریشانیوں میں گذرتے رہے - اجمل، فرزانہ بوبی اور آیا سب ہی پریشان رہتے تھے - لیکن ان پریشانیوں کا حل ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا - بقول فرزانہ کے ـــــــ اب تو تین سو روپیہ کی فالتو رقم گھر آنے لگی تھی - پھر بھی پریشانی بدستور تھی ـــــــ ذہنی طور سے

بھی اور مالی طور سے بھی۔

ایک دن فرزانہ آفس سے واپس آئی تو اس کو اپنے گیٹ پر کافی بھیڑ نظر آئی۔ خدا جانے ایسی کون سی بات ہو گئی تھی۔ وہ مشکل سے راستہ بناتی ہوئی اندر گئی کچھ لوگوں کی نظر اسکے اوپر پڑی تو وہ چلانے لگے

"مسز اجمل آگئیں۔"

"بوبی کی ممی آگئیں۔"

آیا کی سوگوار صورت برآمدہ میں نظر آئی اور ستیش بڑھ کر اسکے نزدیک آگیا۔

"مسز اجمل۔ میں آپ کا منتظر تھا۔"

"کیوں؟" اسکی سوالیہ نظروں نے پوچھا۔ اور ہونٹ اضطراب میں بس کانپ کر رہ گئے۔

"بوبی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" ستیش نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر یہ جملہ ادا کیا۔ فرزانہ کے ہوش جاتے رہے۔ وہ خوف و دہشت سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس اچانک صدمہ کے لئے اسکا ذہن تیار نہیں تھا۔

"مسٹر اجمل بوبی کو اسپتال لے گئے ہیں۔ آپ میرے ساتھ فوراً اسپتال چلئے۔"

ستیش نے فرزانہ کو اسکوٹر پر بٹھایا۔ اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے مختصراً ساری روداد سنا دی۔ "دھوبی آگیا تھا۔ آیا اس سے کپڑے لینے لگی۔ اتنی دیر میں بوبی باہر سڑک پر نکل آیا اور سڑک پر جاتے ہوئے ایک تیز رفتار ٹیمپو کی زد میں آگیا۔ مسٹر اجمل بھی آگئے تھے۔ اسی ٹیمپو میں وہ بچے کو لیکر اسپتال گئے ہیں۔

"بھیا! میرا بچہ زندہ تو مل جائے گا۔"؟ فرزانہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مسز اجمل آپ بھگوان سے دعا کریں۔ وہی سب کا پالن ہار ہے۔ بوبی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی ہے وہ بے ہوش ضرور ہے۔ اب تک ہوش میں آگیا ہوگا۔"

ستیش نے اسکی ڈھارس بندھائی۔

فرزانہ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ رہ رہ کر اسکی نظروں میں بوبی کا معصوم چہرہ گھوم جاتا اور بار بار اسے یہ خیال تڑپا دیتا کہ وہ اپنے بچے کی طرف سے کتنی لاپرواہ ہو گئی تھی۔ اسے جو وقت اپنے بچے کو دینا چاہئے تھا۔ وہ اِدھر اُدھر گذارتی رہی تھی۔

سامنے ہی بیڈ پر بوبی لیٹا تھا، بے ہوش، زار اور کمزور۔ پہلو میں اسٹول پر اجمل بیٹھے تھے

سوگوار، مضمحل اور اداس ـــــــ فرزانہ کی آہٹ پر انھوں نے نظریں اٹھاکر اس کو دیکھا۔ ان کی ملامت آمیز نظریں اسکی بے پروائی کو اس حادثہ کا ذمہ دار ٹھہرا رہی تھیں ۔ فرزانہ نے سر جھکالیا۔ بوبی کے بیڈ پر وہ ایک کنارے ٹک گئی اور اس کا ننھا منا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خاموشی سے آنسو بہانے لگی ـــــ وہ بے حد شرمسار تھی۔

ڈیڑھ ہفتے کے بعد بوبی کو اسپتال سے چھٹی مل گئی ۔ وہ اب تندرست ہو گیا تھا۔ اتنے دن تک فرزانہ اپنی سدھ بدھ بھولی رہی ۔ اپنی چھٹی کی درخواست وہ ستیش کے ہاتھ آفس بھجوا چکی تھی ۔

جب گھر آنے کے بعد اجمل اپنے آفس جانے کیلئے تیار ہوئے تو فرزانہ نے کچھ کہے بغیر۔ ان کو ایک کاغذ تھما دیا۔

"یہ کیا ہے" ؟ اجمل نے پوچھا۔ اتنے دنوں میں یہ ان کی براہ راست پہلی گفتگو تھی ۔

"میرا استعفیٰ ۔ آفس میں دیتے جائیے گا"۔

"کیوں ؟ کیا سروس چھوڑ رہی ہو" ۔؟

"ہاں" فرزانہ کا لہجہ مستحکم اور پر سکون تھا۔

"میرے بچے اور میرے شوہر کو میری زیادہ ضرورت ہے۔ میں نے آیا کو بھی ہٹا دیا ہے۔ اور بھی اخراجات کم کردوں گی ۔ اور گھر ہی پر رہ کر آپ لوگوں کی دیکھ بھال کروں گی"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے گھر کی بہار دوبارہ لوٹ آئی ہے"۔ اجمل نے ہنس کر کہا۔ اور باہر نکل گئے۔ ننھا بوبی اس کے ساتھ ہی برآمدہ میں کھڑا اپنے پاپا کو ٹاٹا کر رہا تھا۔

فرزانہ نے ہرے بھرے لان پر نظر ڈالی ۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب لان میں گلاب کے پھول کھلے کتنے ہی خوش رنگ پھول جھوم جھوم کر مسکرا رہے تھے ۔ وہ خود بھی مسکرا اٹھی ۔

سچ مچ ان کے گھر کی بہار لوٹ آئی تھی ۔

گھٹتے بڑھتے سائے

یہ ٹکراؤ دراصل دو پیڑھیوں کا ٹکراؤ تھا۔ ورنہ ان کی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بیگ صاحب خاندانی رئیس تھے ان کی شرافت مسلم تھی۔ وہ باوضع اور خوددار انسان تھے۔ گوکہ وہ پرانا وقت نہیں رہا تھا۔ لیکن ——— لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی وسیع وعریض عمارت جو محلسرا کہلاتی تھی ان کی خاندانی عظمت ووقار کی منھ بولتی تصویر تھی۔

محلسرا کی عظمتِ رفتہ کا ثبوت، بلند وبالا محرابیں۔ اونچے ستونوں والی پرشکوہ بارہ دری، منور نشینیں صحنچیاں اور توشہ خانے تھے۔ جن میں سے اب چند ہی حصے سلامت رہ گئے تھے۔ ورنہ کہیں چھت غائب تھی کہیں صرف ستون کھڑے تھے۔ جو حصے ثابت تھے وہ بھی مرمت طلب تھے۔ اتنی بڑی عمارت کو ازسرِنو بنوانا تو دور کی بات ہے۔ مرمت کرانا۔ وہ بھی اس گرانی کے زمانے میں مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس لئے جو حصے ڈھتے گئے وہ ملبہ کی صورت میں وہیں پڑے رہے۔ مردانی نشست کا کمرہ بھی زمیں بوس ہوچکا تھا۔ اور بیگ صاحب نے لمبی چوڑی ڈیوڑھی کو ہی اپنی بیٹھک بنالیا تھا۔

شاگردپیشہ، فیل خانہ اور اصطبل کی عمارت بھی شکستہ اور بوسیدہ ہوگئی تھی۔ ملازم تو کبھی کے اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔ آبادی کے خیال سے بیگ صاحب نے یہ حصہ غریب غربا کو رہنے کیلئے دیدیا تھا۔ جن سے کرایہ لینا وہ اپنی عزت کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور یہ غریب بیگ صاحب کی شرافت اور غربا پروری کے گن گاتے تھے۔ ان میں رکشہ والے بھی تھے، مزدور پیشہ بھی۔ خوانچے والے بھی تھے اور چھوٹے موٹے دوکاندار بھی۔ بیگ صاحب کو ان لوگوں سے بس اتنا سہارا تھا کہ وقت بے وقت دو کام نکل جاتے تھے۔

بیگ صاحب اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ دو لڑکیاں پردیس میں بیاہی تھیں جو کبھی کبھی میکے آتی تھیں۔ اتنی بڑی محلسرا میں بیگ صاحب مع اپنی بیگم کے تنہا رہ جاتے اگر دل بہلانے کے

لئے یہ لوگ نہ ہوتے۔ ایک طرح سے یہی لوگ ان کا خاندان تھے ..... ان کے رشتہ دار تھے .... ان کے عزیز تھے۔

اپنے گھر کے الجھے ہوئے مسئلوں میں یہ لوگ بیگ صاحب کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ شادی بیاہ ہو یا لڑائی جھگڑا سارے معاملات بیگ صاحب ہی نپٹاتے تھے۔ اور یہ بھی انھیں اپنا بزرگ سمجھتے تھے کہ انھیں کے سایۂ شفقت میں برسوں سے رہتے آئے تھے۔

وقت کے ساتھ کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان تبدیلیوں کا اثر لوگوں کے سوچنے کے انداز پر بھی پڑا۔ یہ تبدیلیاں بہت غیر محسوس طریقے پر ہوئی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گمّن اپنے باپ جمّن کے برعکس خودسر، منھ پھٹ اور بکیت نہ نکلتا۔ اسکے کردار کو بنانے یا بگاڑنے میں زیادہ حصہ اس کے قد کاٹھی کا بھی تھا۔ اونچا قد۔ بھرے بھرے فولادی بازو۔ چوڑی چھاتی اور آہنی قوت نے اسے خودسر، مغرور اور باغی بنا دیا تھا، وہ اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بات بے بات سب سے جھگڑا کر بیٹھتا۔ بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لڑائی کے مواقع نکالتا تھا۔ خواہ مخواہ ہر وقت مونچھوں پر تاؤ دیتا رہتا اور گالیاں بکا کرتا کہ اچھے خاصے ٹھنڈے مزاج کے انسان کو بھی تاؤ آجائے۔

یوں تو غریبوں کی شرافت کا کوئی معیار نہ پہلے تھا۔ نہ اب ہے۔ تاہم بیگ صاحب کو ان لوگوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ اور ان کے سامنے اپنی زبانوں کو لگام دیئے رہتے تھے۔ خصوصاً ان اوقات میں تو سب زیادہ ہی مہذب رہتے تھے جب بیگ صاحب اپنی بیٹھک میں ہوتے تھے۔ اور تو اور گمّن بھی ان کا لحاظ کرتا تھا۔

رامو کی گھر والی نے پوریاں اور کچوریاں تل کر خوانچہ میں لگائیں۔ رامو ترکاری کی ہنڈیا لینے اندر گیا۔ اتنے میں گمّن باہر کے نل سے نہا کر واپس آیا تو خوانچہ کے قریب سے نکلتے ہوئے یہ بھی خیال نہ کیا کہ بدن کا پانی کھانے پینے کی چیزوں میں ٹپک رہا ہے۔ رامو نے دیکھا تو نرمی سے کہنے لگا "گمّن بھیا جری کھو بچے سے دور ہٹ کر نکلتے۔ شریر کا سارا پانی کھانے کے سامان میں ٹپکا ہے۔"

"ارے کاکا! کون سالا یہ سب تمہیں کھانا ہے۔" گمّن نے ہنس کر جواب دیا۔

"جو لوگ ہمارے اوپر وشواس کرتے ہیں ان کا مان رکھنا تو ہمارا دھرم ہے بھیا۔"

"ہاں ہاں، دیکھا ہے تم کو بھی اور تمہارے پتے چاٹنے والوں کو بھی۔ سب سالے ایک نمبر کے

ملیچھ ہو۔"

"دیکھو گمّن ـــ الٹی سیدھی بات منھ سے نہ نکالو۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ جوری" رامو کو بھی غصہ آگیا۔ اور گمّن تن کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جھلا کر غصے سے چیخا۔

"ابے بڈھے۔ کچھ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ ابھی ایک ٹھوکر سے سارا خونچہ الٹ دونگا۔"

"تم کون ہوتے ہو ہمارا کھونچہ لوٹنے والے۔ واہ محنت ہم کریں۔ اور تم خالی خولی میں گُسّہ کرکے گرمی دکھاکر ہماری روجی میں لات مارو گے؟ تم کیا جانو محنت کسے کہتے ہیں۔ حرام کی کھا کھا کر مٹائے ہو"۔ گمّن بڑے طیش میں پاگل سانڈ کی طرح بپھر کر جھومتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ بیٹھک سے بیگ صاحب نکل آئے اور گمّن کو ڈانٹتے ہوئے بولے۔

"گمّن خبردار! کیا چیخ و پکار مچا رکھی ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ بڑوں سے نہیں الجھا کرتے۔"

سرکار! یہ رامو ہر وقت چھوا چھوت اور ہندو، مسلمان کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اتنا ہی خیال ہے تو یہاں مسلمانوں کے بیچ کاہے کو رہتے ہو؟"

بیگ صاحب کے اچانک آجانے سے گمّن ذرا سا سٹپٹا گیا۔ اور پالیسی سے کام لیتے ہوئے ایسا داؤں مارا کہ ایک دفعہ تو رامو بھی چکرا گیا۔ لاکھ کچھ ہو بیگ صاحب ایسی باتیں کاہے کو برداشت کریں گے۔ گڑبڑا کر لجاجت سے بولا۔

"سرکار! ہم نے تو ایسی بات کبھی نہیں کی۔ پچیس برسوں سے آپ ہی کے سائے میں رہ رہے ہیں۔ کبھی آپ نے سنا سرکار۔"؟

بیگ صاحب گمّن کی غنڈہ گردی اور شورہ پشتی سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے کوئی اثر لئے بغیر رامو سے دلدہی کے انداز میں بولے۔

"رامو! تم اپنے کام پر جاؤ۔ اس لڑکے کا تو سر پھر گیا ہے۔ روز کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کرتا رہتا ہے۔"

رامو سلام کرکے خونچہ اٹھا کر چلا گیا۔ گمّن اپنی اس بے عزتی پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اور اس دن سے وہ بیگ صاحب کا بھی دشمن ہو گیا۔ وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتا تھا کہ بیگ صاحب کو غصہ آئے۔ لیکن وہ سنی ان سنی کر جاتے تھے۔ وہ اس کل کے چھوکرے کے منھ نہیں لگنا چاہتے تھے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ جب گمّن کی ماں مری تھیں۔ اسوقت وہ پانچ سال کا تھا۔

بیگم صاحب ازراہ ہمدردی وخداترسی اسے اپنے پاس بلوالیتی تھیں اور اپنے سامنے اسے کھلاتی پلاتی تھیں۔ اور بیگ صاحب کے کپڑوں کو کاٹ چھانٹ کرا سکے لئے کپڑے سیتی تھیں۔ اور خود بیگ صاحب اسے پیسہ کوڑی دیکر خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے کہ بن ماں کا بچہ ہے۔ اس کا دل میلا ہو۔ آج جوان ہوجانے کے بعد وہ ان کی ساری شفقتیں اور نوازشیں بھلاکر ہمہ وقت ان کی دل آزاری کے درپے رہتا تھا۔ ان کی عزت کو ملحوظ رکھے بغیر الٹی سیدھی ہانکتا رہتا تھا۔ اس کی ایسی باتوں سے ان کی خودداری مجروح ہوتی تھی۔ وہ گمن کے مقابلے میں آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن گمن کی خودسری سے ایسے مواقع آہی جاتے تھے۔ اور گمن ان کی حکم عدولی کرکے۔ ان کی توہین کرکے اپنے نہ جانے کون سے جذبات کی تسکین کا سامان کرتا تھا۔

کئی بار بیگ صاحب کے دوستوں اور ہمدردوں نے انھیں مشورہ دیا کہ گمن کو نکال باہر کریں لیکن وہ جمن مرحوم کی وفاداریوں اور خدمت گذاریوں کے خیال سے خاموش رہے۔ ان کی خاموشی سے گمن کو اور شہ ملی۔ اور ان کی شرافت کو اس نے اپنی جہالت سے ان کی کمزوری سمجھا۔

ایک دن بیگ صاحب کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہوگیا۔ ان کی محلسرا سے کچھ آگے گلی میں رمضان درزی رہتے تھے اور وہ بیگ صاحب کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ کسی زمانہ میں یہ پورا محلہ ہی بیگ صاحب کے بزرگوں کی ملکیت تھا۔ اور پرانے لوگ پیسے کے بجائے خاندانی عظمت اور نجابت کو مقدم سمجھتے تھے۔ رمضان میاں بھی انہی لوگوں میں تھے جو بیگ صاحب کے روبرو آتے تو ہاتھ باندھ کر بات کرتے۔ اور ان کے منھ سے نکلنے والے ہر لفظ کو اپنے لئے حکم سمجھتے اور ان کی رائے کو اولیت دیتے۔

رمضان میاں آئے تو حسب دستور بیگ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

"ارے رمضان میاں بیٹھو بیٹھو۔ بھئی تم بہت شرمندہ کرتے ہو۔ کہو کیسے تکلیف کی"۔؟

"سرکار۔ گمن نے بڑا عاجز کیا ہے۔ محلے کا لڑکا ہوکر محلے کی بہو بیٹیوں کی عزت نہیں کرتا۔ ایسا اس محلے میں تو کبھی ہوا نہیں سرکار۔ آپکا اقبال بلند ہو سرکار۔ اب تو نئی نئی باتیں دیکھنے سننے میں آرہی ہیں"۔

"آخر بات کیا ہے رمضان میاں"۔؟

"حضور گلی سے گذرتے ہوئے گمّن علانیہ عشقیہ گیت گاتا ہے۔ کل تو حد ہوگئی سرکار! میری بہو دروازہ پر پردہ کی آڑ میں کھڑی بساطی سے کچھ سامان لے رہی تھی۔ گمّن اسے دیکھ کر رک گیا۔ اور خواہ مخواہ بساطی سے چیزوں کا بھاؤ تاؤ کرنے لگا۔ پھر بساطی کو دو روپیہ دیکر بولا۔ یہ ہماری طرف سے تحفہ دیدو۔ جو چیز پسند ہو خرید لیں"۔

بہو گرتی پڑتی میاں کے پاس گئی اور اسے ساری رام کہانی سنائی۔ لڑکا بھی جوان جہان ہے گرم خون جوش کھا گیا۔ وہ تو کہئے سرکار میں گھر پر موجود تھا۔ سمجھا بجھا کر لڑکے کو روکا۔ ورنہ خون خرابہ ہو جاتا۔

"رمضان میاں۔ یہ لڑکا بہت بگڑ گیا ہے۔ روز کہیں نہ کہیں سے اسکی شکایت آتی ہے۔ خیر میں اسے بلا کر سمجھا دوں گا"۔

رمضان میاں ذرا دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ گمّن کو کسی نے خبر کردی کہ رمضان بیگ صاحب کے پاس تمہاری شکایت لیکر گیا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ گمّن سیدھا بیگ صاحب کے پاس پہنچا۔ اور بدتمیزی سے کہنے لگا۔

"کیا رمضان یہاں آیا تھا"؟

"ہاں۔ اور وہ تمہاری بہت شکایت کر رہا تھا۔ گمّن میں بہت دنوں سے تمہاری حرکتیں دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہی سب کرنا ہے تو جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ یہاں رہنا ہے تو شرافت سے رہو۔ لوگوں کو تو یہی پتہ ہے کہ تم سب میرے آدمی ہو اس لئے میرے پاس شکائتیں لے کر آتے ہیں۔ انھیں کیا پتہ کہ تم نے عزت سے نہ رہنے کی قسم کھائی ہے"۔

"لگتا ہے رمضان نے آپ کے بہت کان بھرے ہیں۔ میں اسکو اچھی طرح مزہ چکھاؤں گا"۔

"سب کو مزہ چکھانا لیکن اپنے کرتوت نہ چھوڑنا"۔

"سرکار آپ ایک بات کان کھول کر سن لو! گمّن کہیں نہیں جائیگا۔ یہیں رہے گا۔ اور جو جی چاہے کرے گا کسی کی دھونس نہیں سہے گا۔ ہاں"۔

گمّن دھڑ دھڑاتا ہوا چلا گیا۔ اور بیگ صاحب غصّے سے تھر تھر کانپتے رہے۔ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ اور اس کا تدارک کرنا ضروری تھا۔ ورنہ گمّن سارے محلے کا سکون درہم برہم کردیگا۔ بیگ صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ جلد سے جلد گمّن کا کوئی انتظام کریں گے۔

بیگ صاحب کے احاطے میں رہنے والے مختلف مذہب کے لوگ تھے۔ لیکن برسوں سے ایک جگہ رہتے رہتے ان میں آپس میں میل محبت بڑھ گیا تھا۔ اور آپس میں شادی بیاہ بھی ہونے لگے تھے۔ اور میل جول رشتہ داریوں میں بدل چکا تھا۔

ببر علی کی لڑکی مہرن بیاہ کے قابل ہوئی تو دین محمدؐ نے اپنے لڑکے جان محمد کا پیام دیا۔ جان محمد ایک اسکول میں چپراسی تھا۔ نیک اور شریف تھا۔ مڈل پاس تھا۔ سرکاری نوکری تھی۔ اس لئے ببر علی نے رشتہ منظور کر لیا۔ گمن نے رشتے کی بات سنی تو غصے میں تنتناتا ہوا جا کر ببر علی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور شیر کی طرح دھاڑا۔

"ببر چاچا —— ! مہرن کی شادی میرے سوا کہیں نہیں ہوگی۔ اسلئے کہ مہرن میری منگیتر ہے"

"منگیتر و نگیتر تو خیر نہیں ہے۔ ہاں تمہارے مرحوم باپ نے ایک بار کہا ضرور تھا۔ لیکن اب اگر وہ بھی زندہ ہوتے تو اس رشتے کی بات زبان پر نہ لاتے۔"

"کیوں آخر کیا خرابی ہے میرے اندر۔ اس سالے جان محمد کو تو چٹکی سے مسل کر پھینک سکتا ہوں"۔

"بیٹا۔ عورت کو طاقت کی نہیں روٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ طاقت سے پیٹ نہیں بھرا کرتا۔ اور پھر تمہاری حرکتیں سارا زمانہ جانتا ہے۔ میں آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگل سکتا۔ مہرن میری اولاد ہے۔ جہاں میں چاہوں گا وہیں اسکا بیاہ کر دوں گا"۔

ببر علی نے صاف جواب دیدیا۔ گمن بکتا جھکتا چلا گیا۔ لیکن اب ببر علی کو گمن کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے بیگ صاحب سے مشورہ کیا تو انھوں نے مہرن کو محلسرا میں بیگم صاحب کے پاس رہنے کو بھیج دیا۔ گمن اندر نہیں جا سکتا تھا۔ کم از کم اس طرح لڑکی کی عزت تو محفوظ تھی۔ یہ حال دیکھ کر گمن، بیگ صاحب کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ کئی بار اس نے ان سے مہرن کو باہر بھیجنے کے لئے کہا۔ لیکن بیگ صاحب نے انکار کر دیا اور گمن کو پولیس کے حوالے کر دینے کی دھمکی دی تو وہ اور ان کا دشمن ہو گیا اور اس نے قسم کھائی کہ ایک دن مہرن کو ضرور اڑا لے جائیگا۔ اور بیگ صاحب نے بھی اس کے چیلنج کو بھی اس طرح قبول کیا کہ قسم کھا کر عہد کیا کہ ان کی زندگی میں کوئی مہرن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اب وہ دونوں صرف حریف تھے۔ نہ کوئی بڑا تھا نہ چھوٹا۔ نہ مالک۔ نہ رعایا نہ رئیس۔ نہ غریب —— بیگ صاحب کو اپنی عزت و وقار عزیز تھا۔ وہ اپنی آن پر جان دینے

والوں میں تھے۔ بات کے دھنی اور قول کے پکے تھے۔ تو دوسری طرف گمّن کو اپنے بازوؤں کی قوت پر بھروسہ تھا۔ اور وہ ہر وقت بیگ صاحب کو زک دینے کی فکر میں رہتا تھا۔

ایک دن صبح ہی صبح تھانے سے دروغہ جی چند کانسٹبلوں کے ہمراہ بیگ صاحب کے پاس آئے

"سرکار۔ آپ کو سویرے سویرے زحمت دی اسکے لئے ہم آپ سے معافی کے خواستگار ہیں"۔

"ارے نہیں دروغہ جی۔ آپ بھی تو قانون کے محافظ ہیں۔ اور یہ تو آپکا فرض ہے کہ وقت اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر کام کریں"۔ دراصل ہمیں گمّن کی تلاش ہے"۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کس سلسلے میں گمّن کی تلاش ہے"؟

"رات محلے میں زبردست چوری ہوئی ہے۔ ہمیں گمّن پر بھی شبہ ہے۔ سالا کام کا نہ کاج کا۔ اینڈا اینڈا پھرتا ہے تو پھر خرچ کہاں سے پورا ہوتا ہے۔ ضرور چوری چکاری کرتا ہے۔ عرصہ سے اس کی شکائتیں مل رہی ہیں"۔ ——— "خیر ...۔ یہ پتہ لگانا تو آپ کا کام ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں دروغہ جی .... گمّن چور نہیں ہے ..... وہ خود سر بدزبان اور بے ڈھب ضرور ہے۔ لیکن چور نہیں ہے برسوں سے احاطہ میں رہتا ہے۔ کبھی کسی کی سوئی تک نہیں گئی۔ چور بھلا مان سکتا ہے ....؟ مجھے یقین ہے کہ وہ چوری جیسی ذلیل حرکت نہیں کرے گا"۔

"سرکار! آپکا خیال نہ ہوتا ۔ تو گمّن کئی بار جیل کی ہوا کھا چکا ہوتا ——— لیکن سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس کے خلاف کوئی پکا ثبوت نہیں مل سکا"۔

اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں قانون کا پہلے ساتھ دیتا۔ بعد میں چاہے خود مجھے گمّن کی ضمانت کرنا پڑتی۔

دروغہ جی بیگ صاحب کو سلام کر کے چلے گئے۔ اور پھر انھوں نے چوری کے سلسلے میں گمّن کی تلاش چھوڑ دی۔ گمّن کو بھی اڑتی پڑتی خبر مل گئی کہ بیگ صاحب کی سفارش سے اسکی جان بچ گئی۔ ورنہ وہ تو چوری کی خبر سنتے ہی اسی لئے غائب ہو گیا تھا کہ دروغہ عرصہ سے اس پر دانت لگائے بیٹھا تھا۔ اس موقع پر وہ اسے حوالات میں ٹھونسے بغیر نہ مانتا۔

گمّن نے اس بات سے کیا تاثر لیا ——— یہ تو وہی جانے۔ لیکن بظاہر تو بیگ صاحب سے تناتنی کا وہی عالم تھا۔ اور بیگ صاحب بھی لچکنے کو تیار نہیں تھے۔

پچھلے سال سوکھے نے اتنی تباہی نہیں مچائی جتنی قیامت اس سال کی بارش نے توڑی تھی ہر جگہ سیلاب آرہا تھا لوگ بے گھر بے در ـــــــ ادھر ادھر کیمپوں میں پڑے تھے۔ عمارتیں ٹپک رہی تھیں۔ بوسیدہ گھر دھڑا دھڑ گر رہے تھے۔ بیگ صاحب نے احاطہ کے سب لوگوں سے عمارت خالی کرنے کے لئے کہہ رکھا تھا۔ لیکن بے چارے اس بھری برسات میں کہاں جاتے ــــ؟ مجبوراً بیگ صاحب نے عورتوں اور بچوں کے لئے بیٹھک خالی کردی اور مردگلی میں دو دکانوں کے برآمدوں میں راتیں بسر کرنے لگے۔ بس ایک گمن تھا جو مدت سے لاپرواہ۔ ڈھٹائی سے اپنی کوٹھری میں رہتا رہا۔ تیرہ چودہ دن سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ کاروبار ٹھپ تھے۔ انسانی زندگی مفلوج تھی، لوگ چھتوں کے نیچے بھی خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے۔ اور بارش رکنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ گومتی بھی بپھری ہوئی تھی اور اس کا پانی دور دور تک پھیل گیا تھا۔ روزانہ مکانوں کے گرنے اور انسانوں کے مرنے کی خبریں آرہی تھیں۔

بیگ صاحب کی محلسرا کے اونچے ستون، بلند محرابیں اور آسمان کو چھوتی ہوئی دیواریں۔ پکی پھوٹ کی مانند کھلی ہوئی تھیں۔ سب لوگ راتوں کو جاگتے رہتے تھے اور بخیریت صبح ہونے کی دعائیں مانگتے تھے۔

تین پہر رات گذر چکی تھی۔ لیکن بارش کا زور ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا۔ اچانک فضا زوردار گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ جیسے سیکڑوں جنگی جہاز سر پر سے گذر رہے ہوں اور پھر دھماکوں سے زمین لرز اٹھی۔ محلسرا کی عمارت دھڑا دھڑ گر رہی تھی۔ شاگرد پیشہ بالاخانہ، سب ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار اور آہ و زاری سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ آس پاس کی عمارتوں سے لوگ نکل کر دوڑے چلے آرہے تھے۔ قیامت صغریٰ کا سا منظر تھا۔

اچانک کسی کی چیخ سنائی دی۔ "ہائے اللہ سرکار کی خواب گاہ بھی ڈھیر ہوگئی۔ بیچارے سرکار" اچانک گمن نمودار ہوا ـــــــ اور مجمع کو چیرتا ہوا اندر بھاگا۔ اسکی نظر حیران و پریشان مہرن پر پڑی .... تو ایک لمحہ کے لئے اس کے چہرے پر چمک پیدا ہوئی ـــــــ دوسرے پل وہ آگے دوڑ گیا سامنے ہی بیگ صاحب کی خوابگاہ کا ملبہ ڈھیر تھا۔ بڑے بڑے تودوں کو گمن بیتابی سے دونوں ہاتھوں سے ہٹا رہا تھا۔ ساتھ ہی آوازیں بھی دیتا جارہا تھا۔ "سرکار.... مالک ..... سرکار .... مالک"

اسکی آواز کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اسکے ہاتھ چھل گئے تھے اور خون رسنے لگا تھا۔ آخر وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے ملبہ میں سے بیگ صاحب کا زندہ بچ کر نکلنا ناممکن تھا۔ بیگ صاحب کی نورانی صورت اور شفیق چہرہ گمن کی نظروں میں گھوم رہا تھا ـــ آہ اب وہ کہاں دیکھے گا اس صورت کو اس شرافت کے پیکر کو کہاں پائے گا جو قدموں پر گر کر معافی مانگ سکے۔

اچانک کہیں سے ایک شفیق ہاتھ اسکے کاندھے پر آیا اور ایک نرم محبت بھری آواز اسکے کانوں سے ٹکرائی "گمنّ" ـــ

گمنّ جلدی سے مڑا ـــ سامنے بیگ صاحب کھڑے تھے۔ وہ اٹھ کر بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔ اور چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ اور ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے ملنے لگا۔ اور بڑبڑانے لگا۔ "مالک ـــ میرے سرکار ـــ میرے باپ ـــ میرے باپ"

بیگ صاحب کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ اور انھوں نے گمن کو سینے سے لگالیا۔ اور پھر دونوں بچوں کی طرح سسک اٹھے۔

آج ہر فرق اور ہر اختلاف ختم ہو گیا تھا۔

زمین اوپر اٹھی ـــ تو آسمان نے جھک کر اسے گلے لگا لیا۔

قفس

"نشیمن"

جتنا خوبصورت نام تھا۔ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت عمارت تھی۔ سنگ سرخ کی بارہ دری سنگ سفید کی شہہ نشین اور پھر نہ جانے کتنی سہ دریاں۔ دالان اور غلام گردشیں کہ اگر کسی انجان آدمی کو لاکر یہاں چھوڑ دیا جائے تو وہ ان بھول بھلیوں میں چکرا کر رہ جائے۔ آرائش اور سجاوٹ ایسی کہ دیکھنے والا محو ہو کر پتھر کا بنجاتا۔ قیمتی جھاڑ فانوس، مخملیں پردے۔ اور نادر و نایاب اشیاء کا گرانبہا ذخیرہ۔ اس خوبصورت محل کے حسن و وقار میں اضافہ کرتے تھے۔ اور اسکے مالک تھے بڑے حضور۔

حضور بیگم صاحبہ بیاہ کر نشیمن آئیں تو ان کے والدین نے لاکھوں کا جہیز دیا۔ اس جہیز میں پانچ کنیزیں بھی شامل تھیں۔ زمرّد بھی ان میں سے ایک تھی۔ لیکن اسکا رکھ رکھاؤ اور صورت و شکل ایسی تھی کہ وہ کنیزوں سے بالکل الگ۔ خاندانی بیگمات میں سے معلوم ہوتی تھی۔ اسکا پر وقار رویہ اسے سب سے منفرد رکھتا تھا۔ لیکن اپنی انہی خصوصیات کے سبب وہ سب میں نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ بیگمات اس سے خدمت لیتے ہچکچاتی تھیں۔ اور محل کے صاجزادے اس سے عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔

بڑے حضور فطرتاً نیک تھے۔ ان میں عیاشی کی چھچھوری حرکتیں کرنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ لیکن ان کی زندگی میں بھی ایک لمحہ ایسا آیا جب وہ بے اختیار ہو گئے۔ اور اس کا سہرا زمرّد کے سر تھا۔

محل میں کوئی تقریب تھی۔ زمرّد بھی موقع و محل کے اعتبار سے سولہ سنگھار کئے کام کاج میں مشغول تھی۔ سبز ساٹن کا پاجامہ اسکی سڈول پنڈلیوں میں اسطرح پھنسا ہوا تھا .... جیسے پہننے کے بعد سلائی کی گئی ہو۔ زرد ریشم کا پھولدار کرتا اس کے حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ سبز ہی رنگ

کا مہین جارجٹ کا کرن لگا دوپٹہ اسکی گردن میں لپٹا ہوا تھا۔ بالوں کی لمبی سی چوٹی میں سبز ریشمی موباف (ربن) کے ساتھ پھولوں کا گجرا بھی لپٹا ہوا تھا۔ صندلیں۔ کلائیوں میں سنہری بانکیں سجی ہوئی تھیں۔
اس وقت زمرّد ایک ایسی ہی برق نظر آرہی تھی جس نے ہر خرمن دل کو جلا کر خاکستر کر دینے کا تہیّہ کر لیا ہو۔
حضور بیگم محفل میں اپنی مخصوص مسند پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ مقابہ کھولنے کیلئے چابیوں کے گچھے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے زمرّد کو حکم دیا کہ ان کی خوابگاہ سے جاکر لے آئے۔
زمرّد جیسے ہی بھاری پردہ اٹھا کر جھپاک سے اندر گھسی۔ بڑے حضور چونک اٹھے۔ ایک برق سی لہرائی اور وہ اسکی تیز روشنی میں چندھیا سے گئے۔
حسن دراصل جوانی کا نام ہے۔ اور قیامت اسے کہتے ہیں جب ایک بھرپور جسم خوشبوؤں میں بسا اتنا نزدیک ہو کہ اس سے اٹھتی ہوئی لپٹیں نہ صرف محسوس کی جا سکیں۔ بلکہ جل جانے کا خطرہ بھی موجود ہو۔ قیامت اسکو کہتے ہیں۔ اور زمرّد بڑے حضور کی موجودگی اور پھر اس سے بھی زیادہ ان کی پُرشوق نظروں کی گرمی سے گھبرائی جا رہی تھی۔ اور سوا پاؤ چاندی کا چابیوں کا گچھا اسے کہیں نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ سنگھار میز، چوکی اور الماری سب جگہ اس نے دیکھ ڈالا۔ پھر زچ ہو کر بولی۔
"حضور! چابیوں کا گچھا لینے آئی تھی۔ تلاش کے باوجود نہیں مل رہا ہے۔"
"وہ۔ وہ تو یہاں ہے تکیہ کے نیچے۔" بڑے حضور ذرا سا اٹھے۔ چابیوں کا گچھا نکالا۔ اور اسکی طرف بڑھا دیا۔ زمرّد کو مجبوراً ان کے قریب آنا پڑا۔ اور اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ بڑے حضور کی آنکھوں کے سامنے سنہری بانکیں جگمگا رہی تھیں۔ اور ان کے دل میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اور تب انھوں نے اس کی کلائی تھام لی۔ گرفت مضبوط تھی۔ زمرّد نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ کشمکش میں کئی بانکیں چٹ چٹ کر کے ٹوٹ گئیں —— بڑے حضور مسکرا دیئے۔
"ایک دم جنگلی ہے یہ لڑکی —— اسے تو آداب محبّت بھی خود انہی کو سکھانا پڑیں گے۔"
—— اور انھوں نے ایک زوردار جھٹکا دیا تو زمرّد ان کی آغوش میں آرہی۔ بڑے حضور کو نشہ سا محسوس ہونے لگا۔
"حضور! —— میں —— میں" —— زمرّد نے کچھ کہنا چاہا۔

"بھاڑ میں ڈالو چابیوں کے گچھے کو۔" بڑے حضور نے جھلا کر اسکی بات کاٹی۔ زمرّد بنا ذراب بھی خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ بڑے حضور نے کچھ غصّے سے کچھ پیار سے کہا۔

"زمرد تم جانتی ہو کہ میں دل پھینک عاشق نہیں ہوں۔ لیکن دل آنے کے ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں —— پتہ نہیں کیوں اسوقت ——"

"حضور میں آپ کے لائق نہیں ہوں۔"

"ہیرے کی پرکھ جوہری کو ہوتی ہے زمرد۔"

"محمود جوہری تو نہیں ہے حضور! لیکن اس نے دل کی انگشتری میں اس حقیر زمرّد کو جڑ لیا ہے۔ اور میں بھی خوش ہوں کہ وہ بھی کوئی ایسا ویسا نہیں۔ حضور کا دودھ شریک ہے۔"

بڑے حضور کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی —— اور زمرّد اپنا بے ترتیب لباس درست کرنے لگی۔

"محمود کی ماں نے مجھے دودھ پلایا تھا۔ اور وہ میرا دودھ شریک بھائی ہے۔ شریف انسان گھر کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے زمرّد۔ تم اس بات کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ میں حضور بیگم پر زور ڈال کر تم دونوں کو ایک کرنے کی کوشش کروں گا۔

زمرد چابیوں کا گچھا لیکر انھیں سلام کر کے رخصت ہو گئی۔ اور بڑے حضور شرمسار سے سوچوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوبے لیٹے رہے۔ اسی طرح انجانے میں نہ جانے کتنی بہو بیٹیوں کی عزت پامال ہو جاتی ہے۔ اگر زمرد بھی خاموش رہتی تو انھیں ساری زندگی محمود اور زمرد سے شرمندہ رہنا پڑتا۔

بڑے حضور نے محمود سے شادی کے لئے بات کی تو وہ بھڑک اٹھا۔ یہ بھی شاید دکھاوا ہی تھا۔ "حضور زمرّد کنیز ہے ذات پات بھی اچھی نہیں ہے۔ اس سے شادی —؟"

"محمود! کیا تم اب تک اس سے ایک معمولی کنیز سمجھ کر محبت کا کھیل کھیلتے رہے تھے۔ قسم ہے اس ماں کے دودھ کی جو ہم دونوں نے پیا ہے۔ اگر تم نے اس سے شادی نہ کی — تو ہم کبھی تمہیں معاف نہیں کریں گے۔ یہ بات ہم جانتے ہیں کہ وہ کتنی عصمت مآب ہے اور بلند کردار لڑکی ہے۔ ایسی شریک حیات تو قسمت سے ملتی ہے۔"

محمود بڑے حضور سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی شادی محمود سے ہو گئی بڑے حضور نے محمود کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا۔ اور زمرد کو خدمت سے آزاد کر دیا۔ ان ساری نوازشوں

کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنے مالکوں پر اور زیادہ جان چھڑکنے لگی۔
بلبل پیدا ہوئی تو بڑے حضور نے محمود اور زمرد کو اسکی ذمہ داریوں سے آزاد کر کے خود اسکی پرورش کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اسطرح بلبل بچپن ہی سے ان کی خصوصی محبت اور توجہ کی حقدار بن گئی۔ اور جب زمرد کا انتقال ہوا تو ان کی یہ محبت اسکے تئیں کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ اسے بہت چاہتے تھے۔ اور اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھتے تھے —— یہ بات ان کے صاحبزادوں کو بہت کھٹکتی تھی۔ ان کا ہر داؤں خالی چلا جاتا تھا۔ اور غضب یہ تھا کہ سارے محل میں بلبل جیسی ایک بھی قتالہ نہیں تھی۔ حالانکہ بلبل کو یہ محل اور اسکی لگی بندھی زندگی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ تو پنچھی کی مانند آزاد فضاؤں میں اڑنا چاہتی تھی۔ محل کی اونچی اونچی دیواریں، آہنی پھاٹک اور بھاری قفل اسے قید کا احساس دلاتے تھے۔ اور یہ محل اسے قفس معلوم ہوتا تھا۔ محل سے باہر کی دنیا کا تصور بہت حسین تھا۔ لیکن اسے اس دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ البتہ وہ اس قفس سے آزاد ہونے کی دن رات دعائیں مانگتی تھی۔
بلبل کو کبھی کبھی بڑے حضور سے بھی خوف آنے لگتا تھا کہ کیا پتہ کب بڑے میاں کی نیت خراب ہو جائے۔ وہ ان کی ہر وقت کی چوکسی سے بھی نالاں رہتی تھی۔ دونوں صاحبزادوں سے الگ ناک میں دم تھا۔ جہاں اسے اکیلا پاتے، پکڑ لیتے اور وہی راگ الاپنے لگتے۔ ہجر، تڑپ، آہیں دھواں، عشق وغیرہ۔ اسے اس ذکر سے نفرت تھی۔ اس کے تو سپنوں کا شہزادہ خوب تندرست و توانا مرد تھا۔ جو عشق و محبت کی فرسودہ باتیں بگھارنے کے بجائے بس ایک دم اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر کر اپنی بھرپور محبت کا ثبوت دیتا تھا۔ لیکن وہ شہزادہ محل کی اونچی اونچی دیواریں پھلانگ کے اسکے پاس نہیں آسکتا تھا۔ اور نہ وہ اسکے پاس جا سکتی تھی۔ دونوں کو وقت کا انتظار تھا۔
اسے ایسے بزدل مردوں سے نفرت تھی جو اپنی بیویوں سے چھپ کر محل کے اندھیرے اور سنسان گوشوں میں اس سے عشق بگھارتے تھے۔ اور بیویوں کے سامنے اس سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے اپنی پارسائی کا بھرم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔
بڑے صاحبزادے نے موٹر خریدی تو بیگموں کو روز روز تفریح کی سوجھنے لگی۔ اس طرح بلبل کو بھی باہر کی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ باہر کی دنیا کتنی روشن، ہوادار اور خوبصورت

تھی۔جب وہ دوبارہ محل میں واپس آتی تو اپنی اسیری کا احساس اور زیادہ تڑپاتا۔

ایک دن جب بڑی بہو میکے جانے لگیں تو ان کے آدھا درجن بچوں نے موٹر پر ہلّا بول دیا۔ سب لوگ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ان کی دیکھ بھال اور روک تھام کے لئے بلبل کو آگے بیٹھنا پڑا۔

مسرت خاں ڈرائیور بلبل کو دیکھ کر مسکرایا تو وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔ اسے لگا کہ وہی اسکے سپنوں کا شہزادہ ہے۔اور اسکے معصوم سے دل میں خواہش ابھری کہ مسرت خاں اس پنجرے کی تیلی کھول کر اسے آزاد کرالے۔

ایک روز مسرت خاں نے موقع پاکر اس سے کہا۔" آج رات دو بجے ڈیوڑھی پر ملو، میں انتظار کروں گا۔"

بلبل کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ چلا گیا پہلے کی طرح ڈیوڑھی پر پہرہ تو رہتا نہیں تھا۔البتہ بھاری بھاری قفل پھاٹک میں لگا دیئے جاتے تھے۔اور چابیوں کا گچھا بڑے حضور کے سرہانے رکھ دیا جاتا تھا یہ روزانہ کا معمول تھا۔

بڑے حضور کی خوابگاہ سے ملحق صحنچی بلبل کی تھی اس لئے چابیوں کا اڑا لینا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔لیکن وہ سخت الجھن میں گرفتار تھی کہ اتنی رات کو مسرت خاں سے ملنے جائے یا نہیں؟

بڑے حضور کو دوا کی آخری خوراک نوش کرا کے بلبل نے انھیں رضائی اچھی طرح اڑھا دی۔پھر بتیاں بجھا کر ہلکی روشنی والا لیمپ جلا کر وہ باہر آگئی سونے لیٹی تو نیند نہیں آئی۔اور جب کروٹیں بدلتے بدلتے دو بج گئے تو وہ اٹھ بیٹھی۔بڑے حضور کی خوابگاہ میں جھانکا تو وہ بے خبر سو رہے تھے۔چابیوں کا گچھا لیکر وہ آہستہ قدموں سے باہر نکلی —— اور پھر پھاٹک کا قفل کھول کر باہر ڈیوڑھی میں جا پہنچی۔

مسرت خاں اس کا منتظر تھا۔

خوابوں کے شہزادے کی طرح اسنے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

"بلبل کب تک اس قید خانے میں سزا بھگتے گی۔میرے ساتھ چل۔باہر کی دنیا بہت خوبصورت ہے۔ہواؤں میں خوشبو ہے۔زمین و آسمان حد نظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔آزاد پنچھی کی طرح جہاں چاہے اڑتی پھرنا۔"

"میں بھی اس زندگی سے بہت تنگ آگئی ہوں مسرت خاں" اس نے مسرت خاں کی چوڑی چھاتی میں چہرہ چھپالیا۔

"گھبرانا نہیں، میں بہت جلدی تجھے اس قفس سے آزاد کرالوں گا"

"میں ساری عمر لونڈی بن کر تیری خدمت کرونگی"

"تو تو میرے دل کی رانی بنے گی بلبل" مسرت خاں اسکے ہونٹوں پر جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولا تو وہ شرما گئی۔

اس رات سردی بہت تھی۔ محل کے سب لوگ اپنے نرم و گرم لحافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ بلبل نے اس رات مسرت خاں کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور وہ بڑی بے چینی سے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

بڑے حضور کو دوا کی آخری خوراک نوش کرا کے بلبل نے انھیں دونوں لحاف اڑھا دیئے اور انکی خوابگاہ سے باہر آتے وقت چابیوں کا گچھا بھی لیتی آئی۔ اور جب گھڑی نے ایک بجایا تو بلبل نے اپنے کپڑوں کی مختصر سی پوٹلی اٹھائی اور دھیرے دھیرے پھاٹک کی طرف بڑھنے لگی۔ بڑی مشکل سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قفل کھولا۔ اور بھاری پھاٹک کا پٹ ذرا سا کھول کر اس نے جیسے ہی ایک قدم بڑھایا —— ایک بھاری ہاتھ اسکے کاندھے پر آہستہ سے پڑا —— اسکی چیخ نکل گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا بڑے حضور رضائی میں لپٹے اسکے سامنے کھڑے تھے۔

"بلبل! اچھی بیٹیاں اس طرح باپ کے منھ پر کالک لگا کر نہیں جاتیں۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے دلہن بنا کر اس ڈیوڑھی سے رخصت کرونگا"

بلبل کے ہاتھ سے پوٹلی گر گئی۔ اور وہ ان کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ بڑے حضور نے اسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔

پھر وہ اسکا ہاتھ تھام کر باہر نکلے مسرت خاں بلبل کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ بڑے حضور کو بلبل کے ہمراہ دیکھ کر اس کے دیوتا کوچ کر گئے۔

بڑے حضور نے مسرت خاں کو خوفزدہ دیکھا تو مسکرانے لگے۔ "مسرت خان! تو تو پٹھان کا بچہ ہے۔ بزدلوں کی طرح رات کے اندھیرے میں آنے کے بجائے دن کے اجالے میں بلبل کو بیاہنے آ

تو مجھے بھی اطمینان ہو کہ بلبل محفوظ ہاتھوں میں ہے"۔

مسرت خاں نے ان کے پیر چھو کر وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔

بلبل کا عقد مسرت خاں سے بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ شادی کی پہلی رات بلبل نے اس سے کہا "مسرت خاں ایک بات کا وعدہ کر ــــــ اس محل کو چھوڑ کر کبھی نہیں جائیگا"۔

"کل تک تو تم یہاں سے آزاد ہونے کے لئے بے قرار تھیں۔ باہر کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی تمنا تھی ــــــ اب"۔

"وہ میری بھول تھی مسرت خاں۔ لاکھ کچھ ہو پنچھی کو اس قفس سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے زندگی کے اتنے سال گذارے ہوں۔ پھر بڑے حضور جیسے چاہنے والے بزرگ کو میں اپنی زندگی میں نہیں چھوڑ سکتی"۔

"تیری مرضی"۔

مسرت خاں نے اسے سینے سے لگالیا۔ اور بلبل نے ایک آسودہ سی سانس لے کر اپنا چہرہ اسکی چھاتی میں چھپالیا۔

پچھتاوا

فوزیہ کالج سے تھکی ماندی واپس آئی تو برآمدے میں سوٹ کیس، ٹرنک اور الم غلم سامان پڑا نظر آیا۔

"شائد کوئی مہمان آیا ہے۔" اس نے سوچا۔ اسی وقت پہلو کے کمرے سے ثوبیہ نکل آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

"باجی۔ میری اچھی باجی۔" ثوبیہ چھوٹی سی بچی کی مانند اس سے لپٹی ہوئی تھی۔

"ارے ثوبی! اس طرح اچانک ہی آگئی۔" اس نے ثوبی کو پیار کیا تو وہ سسک اٹھی۔

"پگلی!" ـــــــــ فوزیہ نے پیار سے کہا اور اسے کمرے میں لے آئی۔

"اچھا تم ذرا دیر آرام کرو۔ لگتا ہے کہ بس ابھی چلی آرہی ہو۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔"

ثوبیہ لیٹ رہی۔ اور فوزیہ برابر کے کمرے میں لباس تبدیل کرنے لگی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو وہیں سے پکار کر پوچھنے لگی۔

"ثوبی! عادل بھی آئے ہیں؟"

"نہیں باجی ـــــــــ وہ"! ثوبیہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

فوزیہ اسکے پاس آکر بیٹھ گئی اور اسکے بالوں کو سہلاتے ہوئے بڑے پیار سے کہنے لگی۔ "ثوبی! عادل نے تم کو ایسی حالت میں تنہا کیوں آنے دیا؟"

ثوبیہ چپ رہی۔

"وہ کسی وجہ سے نہیں آسکتا تھا۔ تو ہم کو لکھ دیتا۔ شہاب جاکر تمہیں لے آتا۔" فوزیہ نے پھر کریدا۔

لیکن ثوبیہ خاموش رہی۔ اسلئے فوزیہ کو شک گزرا کہ وہ شائد عادل سے ناراض ہو کر آگئی ہے۔

"کیا لڑ کر آئی ہے پگلی؟"

"باجی" ثوبیہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

"عادل تو بہت سمجھ دار ہے۔ پھر یہ تم لوگ بچوں کی طرح لڑنے جھگڑنے کیوں لگے؟"

ثوبیہ روتی رہی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فوزیہ نے اسے اٹھا کر اسکا منھ ہاتھ دھلایا۔ اسے چائے بنا کر پلائی اور برابر کے کمرہ میں اسکا سامان قرینے سے جما دیا۔

رات کو جب فوزیہ سونے کے لئے لیٹی تو پھر ثوبیہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ شوہر سے لڑ کر میکے بیٹھ رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ خود وہ بھی تو آج تک پچھتا رہی ہے۔ شوذب سے روٹھ کر ——— زندگی کے کتنے ہی ماہ و سال اسی طرح بیت گئے۔ تنہا اور اداس رہ کر۔ اسکا ذہن ماضی کی وادیوں کے ایک ایک چپے سے یادوں کے سنگریزے چننے لگا۔ ———......!

جوانی کی دہلیز پر کھڑی فوزیہ۔ کالج سے آئی اور حسب معمول گنگناتی ہوئی اپنے کمرے میں گھسی... لیکن اچانک ٹھٹک کر خاموش ہو گئی۔ اس کی مسہری پر کوئی لیٹا ہوا بڑے آرام سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اسکی پشت دروازہ کی طرف تھی اسلئے وہ اسے دیکھ نہ سکی۔ البتہ جب اسکی آہٹ پر وہ اسکی طرف گھوما۔ تو صورت نظر آئی۔

"ماشاء اللہ۔ چشم بد دور۔" اس نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔

"جی۔ کچھ مجھ سے فرمایا آپ نے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جی نہیں" میری کہاں مجال کہ آپ کی شان میں گستاخی کروں۔"

فوزیہ نے کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ اسکا سامان غائب تھا اور اسکے بجائے جا بجا پتلونیں، قمیضیں، نائٹ سوٹ، شیونگ سیٹ وغیرہ نظر آرہے تھے۔

"ایسا لگتا ہے کہ میں غلطی سے آپ کے کمرہ میں آگئی ہوں۔" فوزیہ نے منھ بنا کر کہا۔

"جی نہیں۔ میں ہی ہٹ دھرمی سے آپ کے کمرے میں براجمان ہوں۔ آپ فوزیہ ہیں نا؟"

"جی ابھی تک تو یہی کہتے ہیں۔ لگے ہاتھوں اپنا تعارف بھی کرا دیجئے۔"

"مجھے شوذب کہتے ہیں۔"

"بالکل نیا نام ہے۔ لیکن کچھ ایسا برا بھی نہیں ہے۔ خیر آپ آرام کیجئے۔ میں ذرا امی سے پوچھوں کہ مجھ خانہ بدوش کا ٹھکانہ کہاں پھینکا ہے۔"

"دیکھئے مس فوزیہ ——— مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے کہ میری وجہ سے آپ کو پریشان ہونا پڑا میں تو چچا جان سے یونہی ملنے آگیا تھا۔ لیکن .... انھوں نے ......

"وزبردستی آپ کو روک لیا"؟ فوزیہ نے اسکا جملہ پورا کر دیا۔ "ارے بھئی جب کوئی شریف آدمی مع سامان کے کسی سے ملنے آتا ہے تو اسکو زبردستی روکنا تو ہر شریف آدمی کا فرض ہو جاتا ہے۔"

فوزیہ کی بات پر شوذب کھسیانہ ہو گیا۔ اور فوزیہ کمرہ سے نکل گئی۔ شوذب خود کو کوسنے لگا کہ ناحق ابوّ کے کہنے میں آکر ان کے دوست کے گھر چلا آیا۔ ابو نے تاکید کی تھی کہ میرے رہنے سہنے کا مناسب بندوبست کر دیں گے۔ یہ شہر اسکے لئے نیا تھا۔ اس لئے اسے ابوّ کی بات ماننا پڑی۔ اب سب تو اچھے رہے۔ خواہ مخواہ ایک چڑچڑی لڑکی کی بے سروپا باتیں اسے سننا پڑ رہی ہیں۔

سرفراز صاحب کا اصرار تھا کہ جب تک کوئی مکان نہ ملے میرے ہی پاس رہو۔ لیکن اس کے واسطے اپنی نک چڑھی بیٹی کا کمرہ خالی کراتے وقت وہ شائد بھول گئے تھے کہ ان کی بیٹی ان سے زیادہ... مہمان نواز ہے۔

شوذب نے طے کیا کہ وہ جلد از جلد مکان تلاش کر کے یہاں سے شفٹ ہو جائیگا۔ مکان نہ ملا تو کسی ہوٹل میں جا رہے گا۔

شوذب باہر جانے کے لئے تیار تھا کہ ملازم چائے کے لئے بلانے آگیا۔ وہ تو جلا ہوا تھا ہی کہلوا دیا کہ اسے چائے کی خواہش نہیں ہے۔ دوسرے ہی پل فوزیہ اسکے سر پر موجود تھی۔

"شوذب صاحب، ابا چائے پر آپ کے منتظر ہیں۔ اس لئے اپنی خواہش کو چھٹی دے کر تشریف لے چلیں۔"

"یہ تو آپ کی زبردستی ہے"

"اور آپ جو زبردستی کر چکے ہیں .... اسے کیا کہتے ہیں؟"

"اسی لئے تو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

فوزیہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ شوذب جھینپ گیا۔

"آپ نے تو میری ذرا سی بات پر منھ پھلا لیا۔ اب تو مجھے شک ہو رہا ہے کہ آپ اسد چچا کے لڑکے ہیں بھی یا نہیں؟ کیونکہ ابا سے ان کی کالج لائف کی شرارتیں سن کر مزہ آجاتا تھا۔ ان کے لڑکے کو اس قدر

خشک نہیں ہونا چاہئے مسٹر۔ سمجھے"!

شوذب اس کے ساتھ ہولیا۔ اور پھر تو وہ ان سب میں اس قدر گھل مل گیا کہ مکان تلاش کرنے کا خیال ہی نہ آیا۔ شب و روز کی یکجائی نے شوذب اور فوزیہ کو بے حد قریب کر دیا اور پھر یہ قربت دائمی رفاقت میں بدل گئی، بزرگوں نے انھیں ایک کر دیا۔ ان دنوں فوزیہ خود کو دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی سمجھتی تھی۔ قدردان سسرال، چاہنے والا شوہر اور ایک خوشگوار زندگی ____ سب ہی کچھ تو اسے حاصل تھا۔

شوذب کے والد کی صحت خراب رہنے لگی تو اس نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ اپنے ہی شہر میں کرا لیا۔ سسرال میں سب نے فوزیہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ شوذب بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس لئے بھی اس کی قدر کچھ زیادہ ہی تھی۔

اسد صاحب کی بیماری نے طول پکڑا تو شوذب پریشان رہنے لگا۔ اس کی آمدنی گھر کے اخراجات کے لئے کم پڑتی تھی۔ چھوٹے بھائی ابھی زیر تعلیم تھے۔ اور اس پر سب کی ذمہ داری تھی۔ ان حالات میں شوذب چڑچڑا رہنے لگا۔ اور قدرتی طور سے اس کی توجہ فوزیہ کی طرف سے ہٹ گئی دوسری طرف فوزیہ ایسے نازک دور سے گذر رہی تھی جہاں اسے شوذب کی مکمل توجہ اور محبت کی ضرورت تھی۔ پہلی بار ماں بننے کا تجربہ جس قدر دل خوش کن تھا۔ وہیں اس لحاظ سے پریشان کن بھی کہ وہ بے حد حساس اور جذباتی ہو گئی تھی۔ روز روز کے چکر اور متلی سے الگ نڈھال رہتی تھی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا تھا۔ طبیعت گری گری رہتی تھی۔

شوذب صبح کو جلدی جلدی تیار ہو کر آفس چلا جاتا۔ واپس آکر والد کا حال پوچھ کر ڈاکٹر کے پاس جاتا، پھر دواؤں اور پھلوں سے لدا پھندا گھر آتا کچھ دیر باپ کے پاس بیٹھتا۔ پھر کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتا۔

فوزیہ چاہتی تھی کہ وہ اسے لے جا کر کسی لیڈی ڈاکٹر سے اس کا چیک اپ کرائے، اپنا زیادہ وقت اس کے پاس گزارے، اسکی ضروریات کا خیال رکھے۔ اسکی یہ خواہش ایک حد تک جائز بھی تھی۔ لیکن شوذب کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اسکی شکائت بے جا معلوم ہوتی تھی۔ اسوقت شوذب کو اسکی ہمدردی اور رفاقت کی ضرورت تھی۔ نہ کہ شکوے شکائتوں کی۔ تھکا ماندہ دماغ اور اداس

دل فوزیہ کی محبت کا طلب گار تھا۔ جو اسے پچھلے دنوں حاصل رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بدظن رہنے لگے۔

اس دن فوزیہ کی طبیعت زیادہ خراب تھی اس نے شوذب سے کہا کہ وہ آج آفس نہ جائے اور اس کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں چلے۔ لیکن ان دنوں آفس میں کام زیادہ تھا، مارچ کا مہینہ ختم ہونے کو تھا، اس لئے وہ چھٹی نہیں لے سکتا تھا۔ تاہم اس نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی آجائے گا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس اس دن وہ اور بھی زیادہ دیر میں گھر پہنچا۔ ——— فوزیہ سخت ناراض تھی۔ شوذب نے تہہ دل سے اپنی غلطی مانی، اور فوزیہ کو منالیا۔

طویل علالت کے بعد اسد صاحب کا انتقال ہو گیا شوذب ان دنوں سخت پریشان تھا۔ ذہنی طور سے بھی اور معاشی طور سے بھی۔ ان ہی دنوں شوذب کو آفس کے کام سے باہر جانا پڑا۔ فوزیہ نے اسے یاد دلایا کہ ڈاکٹرنی نے ڈیلیوری کی یہی تاریخیں دی ہیں۔ لیکن وہ رک نہ سکا۔

جس وقت فوزیہ کی طبیعت خراب ہوئی۔ امی کے سوا کوئی نہ تھا۔ لڑکوں کا انتظار کر کے جب وہ اسے لیکر اسپتال گئیں تو کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کیا۔ آپریشن کے دوران بچہ ختم ہو گیا، اور فوزیہ بھی مرتے مرتے بچی۔ اس حادثہ کا اس کے ذہن پر بہت خراب اثر پڑا۔ جب وہ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آئی تو بالکل ہی بدل چکی تھی۔ وہ ہر وقت خاموش رہتی، شوذب نے اس سے معافی مانگی۔ لیکن وہ اسے معاف نہ کر سکی۔ اپنے بچے کی موت کا ذمہ دار وہ سراسر شوذب کو سمجھتی تھی۔ ایک دن جب وہ آفس سے واپس آیا تو فوزیہ کے بجائے کاغذ کا ایک پرزہ ملا۔

"شوذب۔ پتہ نہیں ہمارے بیچ میں یہ ڈھیر ساری غلط فہمیاں کب اور کیسے پیدا ہو گئیں۔ بہت چاہا کہ سب کچھ بھول جاؤں لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ بہتر ہے کہ ہم از سر نو اپنی زندگی شروع کریں۔ میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔"

"فوزیہ"۔

شوذب کو کم از کم یہ امید نہ تھی کہ فوزیہ زندگی کا اتنا اہم فیصلہ اس قدر آسانی سے کر لے گی۔ لیکن یہ فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ اب تو بس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ فوزیہ اپنی غلطی محسوس کر کے خود ہی اس کے پاس لوٹ آئے۔ دوسری صورت میں ان کی راہیں جدا ہوں گی۔

ادھر فوزیہ نے سوچا، غلطی شوذب کی ہے۔ وہ آکر اسے منائیں اور آئندہ کے اپنے سلوک پر

نظرِ ثانی کرنے کا وعدہ کریں۔ لیکن نہ شوذب اسے منانے آئے۔ نہ وہ خود ان کے پاس گئی۔ پھر وقت گذاری کے لئے اس نے سروس کرلی۔ ابا نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنی ضد بھول کر شوذب کو اپنا لے لیکن فوزیہ کی انا یہ توہین برداشت کرنے کو تیار نہ ہوئی۔

اماں اس صدمہ کو لیکر گذر گئیں۔ اور پھر بہت دیکھ بھال کر فوزیہ کی چھوٹی بہن ثوبیہ کی شادی عادل کے ساتھ کردی گئی۔

عادل فزکس کا لکچرر تھا۔ ہنس مکھ، تندرست اور شریف نوجوان تھا۔ ثوبیہ اس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ شادی کے بعد ایک سال بہت مزے میں گذرا تھا۔ پچھلے ہی دنوں تو عادل نے فوزیہ کو یہ خوشخبری لکھی تھی کہ وہ خالہ بننے والی ہے۔ پھر اب ان کے تعلقات اس حد تک کیسے خراب ہو گئے کہ ثوبیہ تنہا ہی چلی آئی۔ وہ اس سے پوچھے بھی تو کیا؟ خواہ مخواہ میاں کی شکایتیں نہیں کرے گی۔ لیکن وہ ثوبیہ کی زندگی برباد نہیں ہونے گی۔ شوذب کے بغیر اس کی زندگی کتنی پریشانیوں میں گذری ہے۔ یہ اسکا دل ہی جانتا ہے۔"

فوزیہ کئی دن تک ثوبیہ کی دل جوئی میں لگی رہی۔ اسے خوب گھمایا پھرایا۔ ساڑیاں خرید کر دیں ننھے منے کپڑے اور سوٹ خرید ڈالے۔

چھٹے دن اس نے ثوبیہ کا سامان اپنے ہاتھوں سے پیک کیا اور اسے جلدی سے تیار ہونے کا حکم دیا۔

"باجی اسوقت کہاں چلنا ہے"؟

"ہم عادل کے پاس جارہے ہیں"۔

"باجی!۔ میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔" ثوبیہ رونے لگی۔ فوزیہ نے اسے رونے دیا۔ خوب رو دھو کر وہ چپ ہوگئی تو اس نے اسے بیٹھالیا:

"ثوبیہ! زندگی بہت طویل ہے، تم اسے عادل کے بغیر نہیں گزار سکو گی"۔

"باجی! آپ بھی تو ——— !

"میں جانتی تھی، تم یہی کہو گی۔ پگلی یہ بھی کوئی زندگی ہے۔؟ صبح سے شام تک کالج میں سر کھپاتی ہوں۔ بیمار پڑتی ہوں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ شکایت کس سے کروں؟ یہ زندگی تو میں نے خود ہی

اپنے لئے پسند کی تھی ۔ سوچا تھا کہ بڑے مزے میں گزرے گی ۔ لیکن جب پڑی تو پتہ چلا کہ زندگی تو وہ خوش گوار ہوتی ہے جہاں شوہر اور بیوی مل جل کر دکھ سکھ بانٹتے ہیں ۔ میں نے ساری زندگی پچھتاوے کی آگ میں جل کر گزاری ہے ۔ شوذب مرد تھے زیادہ دن انتظار نہ کر سکے اور انھوں نے دوسری شادی کرلی ۔ میں یہ بھی نہ کر سکی ۔ اب میں تم کو اس آگ میں جلنے کے لئے نہیں چھوڑونگی ۔"

ثوبیہ خاموش رہی ۔ شائد اسکی عقل میں آگیا تھا کہ وہ عادل کے بغیر نہیں رہ سکتی ———

عادل نے مسکراتے ہوئے ان کا استقبال کیا ۔ ثوبیہ جھینپی جھینپی سی تھی ۔ عادل اسے دیکھکر شرارت سے مسکرا رہا تھا ۔ فوزیہ منھ ہاتھ دھونے کے لئے ہٹی تو عادل نے جھٹ ثوبیہ کو اپنی باہوں میں لے لیا ۔ فوزیہ واپس آئی تو بھی عادل ثوبیہ کو بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھا ۔ ——— فوزیہ منظر دیکھ کر الٹے پیروں لوٹ گئی ۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ ۔ اگر دس بارہ سال پہلے وہ بھی شوذب کے پاس لوٹ گئی ہوتی تو شوذب بھی اسے اسی طرح گلے سے لگا لیتا ——— لیکن ؟

سہارا

آن واحد میں سب کچھ بدل چکا تھا۔ ــــــ زمین ــــــ آسمان ــــــ شجر اور ہوائیں
یہ دنیا ــــــ اور دنیا کی ہر متحرک اور غیر متحرک شئے۔
کل اور آج میں کتنا فرق ہو گیا تھا ــ ؟
ابو کو کاروبار میں لاکھوں روپیوں کا خسارہ ــــ اس صدمہ سے ابو کا ہارٹ فیل ــــ
اور ریاض کا شادی سے انکار ــــــ

اتنی افتادیں اس پر ایک ساتھ ہی آپڑی تھیں۔ اور اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس حادثہ کو بڑا سمجھے..... کس کو چھوٹا.... کس بات کا صدمہ کرے۔ کس کا نہ کرے ۔؟ کس پر آنسو بہائے کس بات پر خاموش رہے ۔؟ کاروبار ختم ہو گیا تھا۔ کم از کم ابو تو زندہ رہتے۔ اور اگر قدرت کو یہی منظور تھا کہ ابو اس طرح بالکل اچانک ان سے جدا ہو جائیں۔ تو وہ اس حادثہ کو مشیت الٰہی سمجھ کر برداشت کر لیتی لیکن ریاض تو اس مشکل وقت میں اس کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ انھوں نے بھی تو اس سے ناطہ توڑ لیا ۔ اور وہ جو سمجھ رہی تھی کہ ریاض کو اسکی دولت سے نہیں۔ اس سے پیار ہے۔ اب اس حقیقت کو پا چکی تھی کہ ریاض در حقیقت دولت کے ساتھی تھے۔ دولت نہ رہی تو انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ اور تو اور انسانیت کے ناطہ بھی وہ اسکے ابو کی موت پر تعزیت کرنے نہ آئے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ اسکی اشک شوئی کریں گے۔ یہ حادثہ تو ایسا تھا کہ غیر بھی اس سے ہمدردی کر رہے تھے۔

ریاض کی بے وفائی اور غیر انسانی رویے نے اسکا دل توڑ دیا تھا۔ ایسی جگہ رہنے سے کیا فائدہ جہاں اپنے غیر بن جائیں۔ جہاں کوئی سہارا دینے والا نہ ہو۔ بلکہ بنے بنائے سہارے ٹوٹ جائیں رشتے بکھر جائیں۔ انسانیت زخمی ہو کر کراہ اٹھے۔

مریم دل شکستہ اور زخم خوردہ ــــ اپنی ماں اور چھوٹے بھائی عامر اور بہن انجو کو لیکر دوسرے

شہر چلی آئی۔ یہاں اس دیار میں اسکا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ نہ اس پر ترس کھانے والا۔ نہ اسکی ہنسی اڑانے والا۔

امی کے پاس پس انداز کیا ہوا چند ہزار روپیہ تھا۔ جس میں تھوڑے دن گذارا ہو سکتا تھا۔ کرائے کے چھوٹے سے مکان میں اپنا مختصر سا سامان جمانے کے بعد اس نے سب سے پہلے معلومات حاصل کر کے قریب کے اسکولوں میں انجواور عامر کا نام لکھوایا۔ اور خود درخواستیں اور ڈگریاں سنبھال کر نوکری کی کوشش میں دوڑ دھوپ کرنے لگی۔ وہ گریجویٹ تھی۔ اسکے علاوہ اسکے پاس کوئی کوالیفیکیشن نہیں تھی۔ اس لئے اسے ملازمت کی زیادہ امید نہیں تھی۔ پھر اس شہر میں اسکی کسی سے جان پہچان تک نہیں تھی۔ اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ بغیر سفارش کے ملازمت نہیں ملتی۔ اس لئے امید کس کے بھروسے کرتی؟

ایک پرائیوٹ فرم کیلئے کلرک کی جگہ نکلی۔ امیدوار کے لئے ٹائپ جاننا بھی ضروری تھا۔ اور مریم کو ٹائپ اسکول میں داخلہ لئے مشکل سے چار ہفتے ہوئے تھے۔ لیکن اس نے درخواست دے دی بگڑی ہوئی قسمت کو آزمانے میں مضائقہ بھی کیا تھا۔؟

انٹرویو میں آنے والی لڑکیاں تو لگتا تھا کہ مقابلۂ حسن میں شرکت کرنے آئی ہیں۔ ہر لڑکی کا باپ بھائی یا شوہر ہزاروں کماتا تھا۔ اور وہ بس وقت گذاری کے لئے یہ جاب کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ میک اپ کی تہوں کے نیچے چھپے ہوئے "افلاس" اور "ضرورت" کو پڑھنے کے لئے ان کی سچ بولتی ہوئی آنکھوں کی گہری اداسی ہی کافی تھی۔

مریم نے سادہ سی شلوار قمیض پہنی تھی۔ دوپٹے کو سلیقہ سے سر پر جمائے وہ اپنی ڈگریوں کا لفافہ سینے سے اس طرح لگائے بیٹھی تھی۔ جیسے یہی اسکی کل کائنات ہو۔

لڑکیاں انٹرویو کے لئے اندر جاتی رہیں۔ اپنی باری پر وہ بھی گئی۔ سامنے ہی بڑی سی آفس ٹیبل کے چاروں طرف چھ لوگ بیٹھے تھے وہ باوقار۔ مہذب اور پڑھے لکھے معقول لوگ نظر آرہے تھے۔ اجازت پاکر وہ ان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ان کے سوالات کے مختصر جوابات دے کر اس نے نظریں جھکالیں۔ یہ سارے سوالات اسکی تعلیم کے متعلق تھے۔ جن کا جواب دینا آسان تھا۔ ایک صاحب نے اس سے نرمی سے کہا۔

"مس مریم! آپ کو ٹائپ نہیں آتا اور ہمیں ٹائپ جاننے والی خاتون کی ضرورت ہے۔"

"سر میں ٹائپ سیکھ رہی ہوں۔ اب اور زیادہ محنت سے سیکھوں گی۔ مجھے ملازمت کی سخت ضرورت ہے۔"

"کیا آپ کے گھر میں کوئی اور ارننگ ممبر نہیں ہے۔"

"بدقسمتی سے کوئی نہیں ہے۔"

"آپ نے امتیازی نمبر لیکر بی۔اے کیا ہے۔ آپکو اسکالر شپ مل سکتی تھی۔ پھر آپ نے اپنی تعلیم کیوں نہ جاری رکھی؟"

"مجھے اپنی تعلیم سے زیادہ اپنے بھائی اور بہن کی تعلیم کی فکر ہے۔ وہ ابھی بہت چھوٹے ہیں۔"

"والد کیا کرتے ہیں۔؟"

"ان کا انتقال ہو چکا ہے۔" اسکی آواز لرز گئی۔

"اوہ۔ معاف کیجئے گا میری بات سے آپ کو دکھ پہنچا۔"

"کوئی بات نہیں سر۔"

"ٹھیک ہے آپ جا سکتی ہیں۔ ہم آپ کے مسئلہ پر ہمدردی سے غور کریں گے اور جلد ہی آپ کو مطلع کریں گے۔" جن صاحب نے والد کے متعلق سوال کیا تھا۔ اور معذرت طلب کی تھی انھوں نے بڑی ہمدردی سے کہا۔ وہ سلام کر کے باہر آگئی۔ مریم جانتی تھی کہ اسے کوئی اطلاع نہیں ملے گی۔ ایسے جملے تو انھوں نے ہر امیدوار سے کہے ہوں گے ـــــ لیکن خلافِ امید اسے ایک ہفتہ کے اندر ہی لیٹر مل گیا۔ اسے بلایا گیا تھا۔ وہ وقتِ مقررہ پر آفس پہنچی تو بڑے بابو نے چپراسی کے ساتھ اسے صاحب کے کمرہ میں بھیج دیا۔

چھوٹا سا خوبصورت سجا سجایا آفس تھا۔ سامنے ہی ریوالونگ چیئر پر جو نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ جنھوں نے اس کا انٹرویو لیا تھا۔

"آداب"۔ اس نے دھیمی آواز میں سلام کیا۔

"سٹ ڈاؤن پلیز" نوجوان نے شائستگی سے کہا۔ وہ بیٹھ گئی۔

"میرے بھائی صاحب ـــــ یعنی نہال احمد صاحب اس فرم کے مالک ہیں...... اور میں ان کا خادم۔ یعنی بھائی۔ اقبال احمد۔ دروازہ پر جو تختی لگی ہے اسکے رعب میں آنے کی ضرورت نہیں ہے

آپ اطمینان سے اپنا کام کریں۔ ہم نے ایک ٹائپسٹ بھی رکھ لی ہے۔ اس لئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو ہمارے بڑے بابو ـــــ یعنی چچا فیضان علی کام سمجھا دیں گے۔ ان سے اپنا اپائنٹمنٹ لیٹر بھی لے لیجئے گا۔

"شکریہ سر"۔ اس نے متانت سے کہا

میں سر نہیں ہوں۔ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ ابھی آپ کو بتایا تو تھا۔ اتنی جلدی بھول گئیں۔

اقبال احمد نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی حاضر ہو گیا۔ "بڑے بابو کے پاس لے جاؤ"۔

مریم انھیں سلام کر کے چپراسی کے ہمراہ باہر آگئی۔

وہ دن مریم کی زندگی میں سچ مچ بڑا خوشگوار تھا چند سو روپیہ کی ملازمت پاکر وہ اتنی خوش تھی کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ پاپا کی زندگی میں اس سے زائد روپیہ تو وہ گھریلو ملازموں کی تنخواہ دیتی تھی دفتر سے واپسی میں مریم مٹھائی لیتی گئی اور امی نے خوشی خوشی نیاز دی۔

مریم باقاعدگی سے آفس جانے لگی۔ ایک چھوٹا سا کیبن تھا جس میں وہ اور صوفیہ بیٹھتی تھیں۔ بغیر ضرورت کے کوئی ان کے کیبن میں نہیں جاتا تھا۔ اس لئے وہ بڑے سکون سے اپنا کام کرتی تھیں۔ اس روز کے بعد مریم اقبال احمد سے بھی نہیں ملی۔ ایک دن چپراسی نے پیغام دیا۔ "صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے"۔

مریم صاحب کے آفس میں گئی۔ اقبال احمد نہیں تھے۔ جو صاحب بیٹھے تھے وہ غالباً نہال احمد صاحب تھے۔ انٹرویو کے دوران وہ انھیں دیکھ چکی تھی ـــــ اس نے ادب سے انھیں سلام کیا۔ اور اجازت پاکر بیٹھ گئی۔

"مس مریم! یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔؟"

"جی نہیں شکریہ سر ـــــ اور ٹائپ بھی میں اچھا خاصہ کرنے لگی ہوں سر"۔

"اوہ ـــ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن اس کے لئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے صوفیہ کو مستقل رکھ لیا ہے"۔

"یہ تو آپ کی مہربانی ہے سر"۔

"آپ اقبال احمد سے ملی تھیں؟"

"جی بس پہلے ہی دن ملاقات ہوئی تھی۔"

"دراصل اسے بزنس سے دلچسپی نہیں ہے۔ بہت کہنے سننے سے کبھی آفس چلا آتا ہے۔" نہال احمد نے چند فائلیں نکالیں۔ ان کے متعلق اسے کام سمجھایا۔ اور وہ سلام کر کے چلی آئی۔ اسکا خیال تھا کہ دونوں بھائی نیک اور شریف ہیں اسلئے اچھی نبھ جائے گی۔

آفس سے واپسی میں مریم اور صوفیہ ساتھ ہی نکلتی تھیں۔ بس اسٹاپ تک دونوں کا ساتھ رہتا تھا۔ پھر جسکی بس پہلے آجاتی۔ وہ چلدیتا۔ روزانہ کا یہی معمول تھا۔ اس دن صوفیہ نہیں آئی تو مریم کو تنہا بس اسٹاپ تک جانا پڑا۔ بس اسٹاپ سے تھوڑا پہلے ہی مخالف سمت سے آنے والی نیلی ایمبیسڈر بالکل اس کے پاس آکر رک گئی۔ اقبال احمد نے سر باہر نکال کر اس سے بے تکلفی سے پوچھا۔

"بھائی صاحب ہیں یا چلے گئے؟"

"وہ ـــــ وہ تو ایک گھنٹہ پہلے ہی چلے گئے۔"

"آپ گھر جا رہی ہیں؟"

"جی ہاں" ـــــ مریم کو اس بے تکے سوال پر دل ہی دل میں ہنسی آرہی تھی۔

"آپکا گھر کہاں ہے؟"

"ناولٹی سے تھوڑا پہلے۔"

"چلئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ میرا راستہ بھی یہی ہے۔ اقبال احمد نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولدیا۔ لوگوں کی نظروں سے بچنے کے لئے وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گھر نزدیک آیا تو مریم نے گاڑی روکنے کے لئے کہا۔

"شکریہ سر"! مریم نے شائستگی سے کہا۔

"آپ بھول رہی ہیں ـــ سر میں نہیں ـــ نہال احمد صاحب ہیں۔ میں تو صرف اقبال ہوں۔ اچھا گڈ بائی۔" اقبال احمد زن سے نکلے چلے گئے۔

دوسرے دن چپراسی نے صاحب کا پیغام دیا۔ وہ اسکے منتظر تھے۔ مریم نے انھیں سلام کیا۔

"بیٹھئے مس مریم"۔ نہال احمد کسی فائل پر جھکے ہوئے تھے۔ چند منٹ کے بعد انھوں نے

سر اٹھایا۔ حلیمی سے مسکرائے۔ اور پھر جیسے کچھ یاد کر کے بولے۔
"کل اقبال ملا تھا آپ کو"۔
"جی ہاں! وہ آپکے پاس آفس ہی آ رہے تھے۔ میں نے انھیں بتا دیا کہ آپ جا چکے ہیں"۔
"ہوں ——— وہ بے خیالی میں بولے۔
"کل ——— کل اقبال صاحب نے ازراہ مہربانی مجھے گاڑی سے گھر تک پہنچایا تھا۔ میں سڑک پر تھی۔ اس لئے انکار نہ کر سکی کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے کہ تکرار ہو رہی ہے"۔
"کوئی بات نہیں مس مریم۔ آپ کا گھر تو ہمارے راستے میں ہے۔ میں روزانہ آپ کو گھر سے لے لیا کروں گا۔ واپسی کا البتہ ٹھیک نہیں رہتا"۔
"شکریہ سر۔ میں بڑے آرام سے آجاتی ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی"۔ مریم نے لہجہ کی سختی پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔
"کیا آپ مجھے برا انسان سمجھتی ہیں"۔
"خدا نہ کرے سر۔ لیکن آپکے اور میرے مراتب میں جو فرق ہے اسے ملحوظ رکھنا چاہتی ہوں۔ میں معافی چاہتی ہوں"۔
"ٹھیک ہے مس مریم۔ آپ مائنڈ نہ کریں۔ اب آپ جا سکتی ہیں"۔
مریم سلام کر کے چلی آئی۔ لیکن اسے سخت الجھن ہو رہی تھی کہ آخر یہ صاحب کو کیا سوجھی۔؟ کیا اقبال احمد کے ساتھ جانے کے سبب وہ اسے غلط تو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ بعض اوقات انسان بغیر سوچے سمجھے کیسی غلطی کر بیٹھتا ہے۔ اس نے عہد کیا کہ اب وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گی۔
عید نزدیک تھی۔ امی اور انجو کے لئے مریم نے اپنی پسند سے کپڑا خریدا تھا۔ لیکن عامر ذرا ضدی اور دلارا تھا۔ وہ اسے ساتھ لیکر بازار گئی۔ ایک بڑی سی دکان کے بیسمنٹ میں وہ داخل ہوئی تو اچانک اسے نہال احمد نظر آگئے۔ اس نے نظر بچا کر نکلنا چاہا۔ لیکن وہ اسے دیکھ چکے تھے۔
"ہیلو مس مریم۔ کیا خریداری ہو رہی ہے"؟
"عامر سلام کرو۔ آپ ہی ہماری فرم کے مالک ہیں"۔
"جیتے رہو بیٹا"۔ نہال احمد نے عامر کے سر پر تھپکی دے کر کہا۔

"شائد انھیں کے لئے خریداری کرنا ہے"؟

"جی ہاں"۔ مریم آہستہ سے بولی اور عامر کا بازو تھام کر کاونٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ نہال احمد نے عامر سے پوچھا۔ "کیوں ماسٹر میری چوائس (choice) چلے گی؟

"کیوں نہیں سر"۔ عامر نے مستعدی سے کہا۔ مریم دل ہی دل میں عامر پر سخت خفا ہوئی اور نہال احمد پینٹ اور شرٹ کے لئے قیمتی کپڑے نکلوانے لگے۔ مریم نے احتجاج کیا۔ "یہ تو بہت مہنگے ہیں۔ عامر ابھی چھوٹا ہے"۔

"تو کیا ہوا۔ بچے ہی تو اچھا کپڑا پہنتے ہیں"۔ نہال احمد نے پرس سے نوٹ نکال کر بل چکانا چاہا تو مریم برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اپنے پرس سے مطلوبہ رقم نکال کر کاونٹر پر رکھ دی۔ نہال احمد نے شاکی نظروں سے مریم کو دیکھا اور افسردگی سے کہنے لگے۔

"آپ غیریت برت رہی ہیں مس مریم"۔

"جی نہیں۔ بلکہ آپ ہمیں غلط راہ دکھا رہے ہیں سر"۔ مریم نے تلخی سے کہا۔ اور عامر کے ساتھ دوکان سے باہر آ گئی۔ سارے راستے وہ چپ چپ رہی۔ عامر سمجھا کہ وہ اتنا مہنگا کپڑا خریدنے کی وجہ سے ناراض ہے۔ وہ روہانسا ہو کر کہنے لگا۔

"آپی ــــ مجھے اتنا قیمتی کپڑا لینے سے انکار کر دینا چاہیئے تھا"۔

"کیا تم نے پہلے گھٹیا کپڑا پہنا ہے"۔

"تب کی اور بات تھی آپی ــــ اب ــــ اب"

"کچھ نہیں پگلے۔ میں جو زندہ ہوں بیٹے۔ تجھے ایسی باتیں نہ سوچنی چاہئیں۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی"۔ عامر مطمئن ہو گیا ــــ اور وہ پھر سوچوں کے اتھاہ ساگر میں ڈوب گئی۔

"یہ دولت والے کس طرح احسان کر کر کے لڑکی کو پھانستے ہیں۔ کبھی کار میں لفٹ کی پیشکش۔ کبھی شاپنگ۔ اور پھر ..... آمدم برسر مطلب"۔ اس نے سوچا کہ اگر یہی رنگ ڈھنگ رہے۔ تو وہ یہ ملازمت چھوڑ دے گی۔

عید سے دو روز قبل نہال احمد نے مریم کے دروازے پر دستک دی۔ عامر نے دروازہ کھولا ان کو دیکھا تو ماں کو خبر کرنے دوڑا گیا۔ مکان میں باہری کمرہ تو تھا نہیں۔ مجبوراً انھیں اندر ہی بلانا پڑا

امی اندر کمرے میں چلی گئیں ـــــــ نہال احمد دالان میں بیٹھ گئے۔ صاف ستھرا۔ سجا سجایا گھر مکینوں کے سلیقے اور خوش ذوقی کا مظہر تھا۔ نہال احمد کو اپنی بڑی سی کوٹھی کی بے ترتیبی یاد آگئی۔ عابدہ مرحومہ کے بعد گھر کی کیسی اجاڑ صورت ہوگئی تھی۔ دوسری شادی نہ کرنے کا عہد وہ اب تک نبھا رہے تھے۔ لیکن انھیں محسوس ہوا تھا کہ گھر کو ایک عورت کے سلیقے کی ضرورت ہے۔ اور یہی ضرورت ان کو کشاں کشاں مریم کے گھر تک لے آئی تھی۔ مریم اس وقت آفس میں تھی۔ اور وہ بڑے اطمینان سے اسکے گھر میں بیٹھے تھے۔

مریم کی امی پردہ کے پاس آکر ان سے مخاطب ہوئیں۔ "تسلیم نہال احمد صاحب"۔

"آداب عرض ہے۔ مزاج اچھے ہیں آپ کے"؟

"اللہ کی مہربانی ہے جناب ـــــــ شکریہ! تشریف آوری کے لئے مشکور ہوں۔" امی نے باوقار لہجے میں کہا۔

"میں اسوقت ایک خاص غرض لے کر حاضر ہوا ہوں"۔

"فرمائیے" وہ ہمہ تن گوش تھیں۔

"مس مریم ہمارے آفس میں چند مہینے سے کام کر رہی ہیں۔ اور اتنے ہی دنوں میں میں ان کی بلند کرداری، شرافت، غیرت، اور اعلیٰ ظرفی سے بیحد متاثر ہوا ہوں۔"

"شکریہ جناب! مریم بھی آپ کی بہت تعریف کرتی ہے"۔

"آپ فرما رہی ہیں تو یقین کرنا ہی پڑے گا" نہال احمد مسکرائے۔ جیسے انھیں اس تعریف کی صداقت پر شک ہو۔ کم از کم مریم کا رویہ تو اس کے برعکس تھا۔

"دیکھئے محترمہ ـــــــ ہم دو بھائی ہیں۔ میری بیوی عابدہ کا چند سال قبل انتقال ہو چکا ہے۔ دو بچے ہیں وہ ہوسٹل میں رہ کر پڑھ رہے ہیں کیوں کہ گھر پر ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

"یہ تو بڑے دکھ کی بات ہے۔"

"بچوں کی فکر سے تو کسی حد تک نجات ملی ہوئی ہے۔ لیکن میرا گھر عورت کے بغیر چوپٹ ہو گیا ہے۔ آپ کے پاس اسی لئے حاضر ہوا تھا کہ آپ۔"........

" نہال صاحب میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ——— واقعی آپ بڑے دل کے مالک ہیں جو ہم غریبوں کے گھر رشتہ کرنے کی خواہش کر بیٹھے۔" ——— لیکن ——— میں ——— دراصل میری بچی پر اچانک مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ باپ کی موت، لاکھ کا گھر خاک ہو گیا۔ لگی لگائی نسبت بھی ختم ہو گئی۔ اسکے باوجود میں اس پر یہ ظلم نہیں کر سکتی۔"

" یہ آپ کیا فرما رہی ہیں محترمہ؟"

" مریم آپ کے گھر کے لائق نہیں ہے جناب۔"

" وہ میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ اگر اقبال کو دیکھیں گی تو ضرور پسند کریں گی۔ وہ میرا چھوٹا بھائی ہے لیکن مجھے اولادوں کی مانند عزیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مریم اسکے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ اور سات برس سے اجڑا ہوا گھر بس جائے گا۔"

" جی ......؟ ...... آپ ...... اقبال میاں کا رشتہ ...... میرا مطلب ہے مریم کو آپ اقبال سے منسوب کرنا چاہتے ہیں۔"

" جی ہاں ——— اتنی دیر سے میں آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مریم اور اقبال کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔"

" اللہ تیرا شکر ہے۔ کاش آج مریم کے ابو زندہ ہوتے۔ تو کتنا خوش ہوتے۔" امی رو پڑیں۔ اور نہال احمد چائے پی کر خوش خوش رخصت ہو گئے۔

مریم نے سنا تو اسے یقین ہی نہ آیا۔ وہ تو نہال احمد کو بھی ان بدنام اور بدقماش لوگوں میں شمار کرنے لگی تھی جو آفس کی لڑکیوں کو دولت کا لالچ دیکر پھانس لیتے ہیں۔ اور کہیں کا نہیں رکھتے۔

مریم بیاہ کر سسرال گئی تو نہال احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مریم! اب اس بھگوڑے کی نکیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اچھی طرح سنبھال کر پکڑنا۔ اب کہیں بھاگنے نہ پائے۔"

" بھائی صاحب ان کی طرف سے تو آپ بالکل بے فکر رہیں۔ انشاء اللہ جس طرح آپ چاہیں گے اسی طرح ہو گا ——— لیکن سب سے پہلے مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔

" کیسی معافی مریم! تمہارا قصور کیا ہے؟"

"بہت بڑا قصور کیا ہے میں نے ۔ میں نے آپکی نیت پر شک کیا ——— مجھے معاف کر دیجئے بھائی صاحب"۔

"دراصل میرا طریقہ ہی ایسا تھا کہ تمہارا شک کرنا بالکل درست تھا مریم ۔ میں تم کو آزما رہا تھا جبھی تو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اقبال کے لئے تم ایک اچھی شریکِ حیات ثابت ہوگی۔ ورنہ آج کل تو عام طور سے لڑکیاں ایسی مراعات کی متمنی رہتی ہیں ۔ خواہ اس کے حصول کے لئے انھیں نسوانیت کے اعلیٰ معیار سے نیچے ہی کیوں نہ گرنا پڑے"۔

——— "اگر آپ کی طرح ہر انسان اپنے بھائی اور بیٹے کے واسطے اسی طرح شریک حیات کا انتخاب کرنے لگے تو کتنی غریب اور شریف لڑکیوں کو سہارا مل جائے کبھی کبھی تو کسی ایسے ہی سہارے کی تلاش میں بیچاریاں ہمیشہ کے لئے بے سہارا ہو جاتی ہیں"۔

مریم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو شفاف قطرے نکل کر سرخ عروسی دوپٹے میں جذب ہو گئے ۔

کتنے جج؟

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے گھر میں ڈھیروں تبدیلیاں ہوگئیں۔ لیکن بس ایک چیز آج بھی ویسی ہی ہے۔ یعنی ہماری رحیمن بوا ــــــــ

بوا ہمارے گھر کب آئیں۔؟ کہاں سے آئیں یہ تو مجھے یاد نہیں۔ میں نے ہوش سنبھالا تو انھیں اپنے گھر ہی میں دیکھا۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ باورچی خانہ ہی میں دیکھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ پیدا ہوئی ہیں۔ صبح سے شام تک وہ اپنی مخصوص پیڑھی پر بیٹھی کام کرتی رہتیں۔ جب تھک جاتیں تو وہیں ایک کنارے بچھے ہوئے اپنے کھٹولے پر پڑ جاتیں۔ نہ وہ خود کہیں جاتیں۔ نہ کوئی ان کے پاس آتا۔ شائد بوا کا کوئی "اپنا" نہیں تھا۔ میں نے ان کی اس تنہائی کے متعلق اماں سے پوچھا تو انھوں نے بس اتنا ہی بتایا کہ بھری جوانی میں میاں سے خفا ہوکر چلی آئی تھیں۔ جب سے یہیں ہیں۔ نہ یہ میاں کے پاس گئیں۔ نہ میاں نے انھیں بلایا۔ اور بیچاری بوا یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔

ہمارا اتنا بڑا خاندان۔ اور اتنے لوگ سب کی پسند ناپسند الگ۔ مزاج الگ کہ اچھا خاصا آدمی ہو تو بوکھلا جائے۔ لیکن بوا بھی کمال کی تھیں۔ سب کو خوش رکھنے کا گر انھیں خوب آتا تھا۔ کیا مجال جو کوئی ناراض ہو جائے۔ دادی اماں کے دلیہ سے لیکر ابا کے پاؤ بلاؤ تک سب کا خیال رکھتیں تھیں شائد یہی وجہ تھی کہ اماں باورچی خانہ سے بالکل ہی بے فکر ہوگئی تھیں۔ کبھی کبھی بوا خود ہی جھنجلا جاتیں۔

"اے دلہن بیگم! کبھی تو یہاں بھی جھانک لیا کرو کہ مردار بوا کیا پکا رہی ہے کیا مٹا رہی ہے۔؟"

اماں ہنس کر چپ ہو جاتیں۔ یا پھر ان کو خوش کرنے کے لئے کبھی کبھی باورچی خانہ میں جاکر کسی ہانڈی میں دو چار ہاتھ کفگیر کے مار کر نکل آتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بوا کی نیت سیر ہے۔ نہ چرا چھپا کر خود کھائیں نہ کسی ایرے غیرے کا پیٹ بھریں۔ گھی، میوے، اچار، مربّے، دودھ دہی۔ مٹھائی کھٹائی سب ان کے ہاتھ حوالہ رہتا۔ جس کو جو کچھ لینا ہوتا۔ جاکر بوا سے مانگ لیتا۔ بے وقت ضد کرتا۔ تو بوا بہلا پھسلا کر ٹال دیتیں۔

مہمان آتے تو بوا خود ہی ناشتہ کی ٹرے تیار کر کے لے آتیں۔ اور مہمان سمجھتے کہ بیگم بڑی منتظم ہیں، بیٹھے بیٹھے سارا انتظام کر لیا۔

گھر میں سب ہی بوا کو چاہتے تھے۔ بوا بھی سب پر جان دارتی تھیں۔ ایک بس انھیں بیر تھا تو کلّو سے ــــــ کیونکہ ہماری بوا خوب گوری چٹی، مکھن ملائی جیسی تھیں اور انھیں کالے رنگ سے بہت چڑھ تھی۔ اور کلو بیچارہ بھرپیٹ کالا تھا۔ بوا اسے دیکھ کر ایسا برا منھ بناتیں جیسے کوئی گھناونی چیز دیکھ لی ہو۔ کوئی کام لینا ہوتا۔ تو اپنے سامنے صابن سے اس کے ہاتھ دھلواتیں۔ لیکن پھر بھی ان کی تسلی نہ ہوتی۔ کلو کی جان ہی نکلتی تھی ان سے۔ اتنا تو وہ ابا سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ کلو بازار سے سودا لیکر آتا تو بوا اسکے سر پر مسلط ہو جاتیں۔ اور کسی سخت تھانیدار کی طرح اس سے جرح شروع کر دیتیں۔

"یہ گوشت کتنا لایا ہے رے؟ آدھ سیر؟ میں نہیں مانتی۔ ڈیڑھ پاؤ سے ایک بوٹی زیادہ نہیں ہے۔ اور یہ سبزی لایا ہے موئے کہ منڈی کی بٹورن ــــ کم بخت چوٹّا بے ایمان۔ لگے ہے کہ کسی دکان سے اٹھا کر بھاگا ہے۔ اور یہ دہی کیسا پتلا ڈھب ڈھب ہے۔ نہ جس پر ملائی۔ نہ چکنائی کھا گیا ہوگا گلی میں۔ تیری نیت پر جھاڑو پھرے مردار.... دیکھنا آج صاحب سے کہہ کر تیری کیسی مرمّت کراتی ہوں۔"

کلو بڑی منت سماجت سے ان کا غصہ ٹھنڈا کرتا ــــــ سچے دل سے کان پکڑ کر وعدہ کرتا کہ آئندہ اچھا سودا لائے گا۔ تب جا کر کہیں بوا اسے معاف کرتیں۔

بس ہمیں بوا کی ایک بات سے چڑھ تھی۔ انھیں پیسے کی بہت ہوس تھی۔ ایک ایک پائی جوڑا کرتی تھیں۔ اپنی تنخواہ اور انعام اکرام میں ملے ہوئے سارے پیسے وہ اماں کے پاس رکھوا دیتی تھیں۔ اور گاہے گاہے یاد بھی دلا دیتی تھیں کہ دلہن بیگم اب اتنے روپئے ہو گئے۔

میں سوچتی تھی کہ بوا روپیہ جمع کر کے کیا کریں گی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ آخر یہ سارا پیسہ کس کام آئے گا۔ نہ انھیں زیور کا شوق تھا۔ نہ کپڑے کا۔ ہاتھوں میں چاندنی کی دو دو چوڑیاں پڑی رہتی تھیں۔ اور کانوں میں پھولدار بالیاں۔ اسکے علاوہ انھوں نے کبھی کوئی زیور نہیں بنوایا۔ ہم لوگوں کے دیئے ہوئے پرانے کپڑوں کو مرمت کر کے پہن لیتی تھیں۔ عید بقر عید یا

شادی بیاہ پر ملے ہوئے جوڑے ان کے بکس میں بند رہتے تھے ۔ نہ پان ڈلی کا شوق تھا نہ کسی قسم کی لت تھی ۔ ہاں انھیں حج کرنے کی دھن سوار رہتی تھی ، اٹھتے بیٹھتے ۔ سوتے جاگتے وہ یہی تذکرہ کرتی تھیں ۔ اور اس کے ساتھ پیسوں کا حساب بھی لگاتی جاتی تھیں کہ اب اتنے روپئے جمع ہو گئے ۔

ایک دن اماں کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں ۔ اماں مشین پر کچھ سی رہی تھیں ۔ بوا چپکے سے پاس آکر بیٹھ گئیں ۔ وہ شائد کچھ کہنا چاہتی تھیں ۔ لیکن کہہ نہیں پا رہی تھیں ۔ ان کی ہچکچاہٹ دیکھ کر اماں نے پوچھا ۔

"کیا بات ہے بوا ۔؟"

" دلہن بیگم ۔ خفا نہ ہونا ۔"

" ایسی بھی کیا بات ہے ۔؟"

" ہمارے پیسے دیدو ۔" بوا نے بہت ڈرتے ڈرتے کہا ۔

" ذرا ہم بھی تو سنیں کہ کیا کام ہے ۔"

اماں مسکرا کر بولیں ۔ تو بوا کا حوصلہ بڑھ گیا ۔ اپنے بالوں کا اچھا خاصا بندھا یا جوڑا کھولکر نئے سرے سے باندھتے ہوئے کہنے لگیں ۔

" وہ پڑوس میں مختارن رہتی ہے نا ؟ اسکی لڑکی تبرتیا کا بیاہ طے ہو گیا ہے ۔ لڑکے والے بیاہ کی جلدی مچا دیں ہیں ۔ بیچاری مختارن کے پاس کوئی انتظام نہیں ہے ۔ میں نے سوچا کہ کنیا کی بات ہے ۔ پیسہ دیدوں تو لڑکی بیاہ جائے "

" حج کے پیسے دوسروں کی شادی بیاہ پر خرچ کر ڈالو گی ۔ پھر مختارن یا اسکی لڑکی سے تمہارا کیا رشتہ ہے جو سارا جمع جتھا حوالے کرنے چلدیں ۔"

" اے دلہن بیگم ! رشتہ تو دل کا ہووے ہے خون کا رشتہ بھی کبھی کبھی اتنا پکا نہیں ہوتا ۔" بوا نے اپنا فلسفہ سمجھانا چاہا ۔

" جو تمہارا دل چاہے کرو ۔ ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے ۔" اماں نے خفگی سے کہا ۔ اور سارے پیسے لاکر بوا کو دیدیئے ۔ پانچسو کچھ روپئے تھے ۔ بوا نادم اور شرمندہ سی پیسے لیکر چلی گئیں ۔ ــــــ

اماں بڑبڑانے لگیں ۔ " عجیب عورت ہے ۔ ایک ایک پیسہ جوڑ کر رکھتی ہے کہ حج کریں گے ۔ اور پھر جہاں

کوئی اس کے آگے رو یا گایا ۔ سارا جمع جتھا جا کر دے آئی ۔ سارے محلے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اس نے کہو تم سے کیا مطلب کہ کسی کا بیاہ رکا ہے ۔ یا برات اٹکی ہے ۔

اماں بڑبڑاتی رہیں اور بوا مختارن کو روپئے دے کر چمکتا ہوا چہرہ لے کر واپس آئیں ۔ جیسے سچ مچ حج کر آئی ہوں ۔ اور اماں کی نظر بچا کر کام میں مصروف ہو گئیں ۔

پھر یہ تو کئی بار ہوا کہ حج کی نیت سے مرکھپ کر روپئے جمع کئے ۔ اور ہنسی خوشی لڑکی کی شادی کے لئے دے ڈالے ۔ محلے والوں کو معلوم تھا کہ بوا پیسہ جوڑتی رہتی ہیں ۔ اس لئے وہ کسی ایسے موقع پر بوا کے سامنے دستِ سوال دراز کر دیتے ۔ اور بوا ان کو کبھی مایوس نہیں کرتی تھیں ۔ اماں کہتیں ۔ "بوا یہی سخاوت کا حال رہا تو تم کبھی حج نہیں کر سکوگی ۔ ذرا دل کو سخت کرو ۔ اور لینا دینا بند کرو ۔" بوا شرمندہ ہو جاتیں اور مسکرا کر بات ٹال جاتیں ۔

اماں نے کلوّ کی شادی کر دی ۔ اور باہر کا کوارٹر اس کو رہنے کے لئے دیدیا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے کلو کی فوج اللہ رکھے بڑھنے لگی ۔

آپا کی شادی ہوئی تو وہ نوشہ بھائی کے ساتھ کویت چلی گئیں ۔ بھائی جان کی سروس دہلی میں لگ گئی اور بھابھی جان کے ساتھ وہیں جا بسے ۔ اماں ، ابا اور میں اتنے بڑے ڈھنڈھار مکان میں اکیلے رہ گئے ۔ وہ ساری چہل پہل اور گہما گہمی ختم ہو گئی جس سے گھر کی رونق تھی ۔

بوا بھی کمزور اور ضعیف ہو گئیں لیکن حج کرنے کی لگن اب بھی جوان تھی ۔ کبھی کبھی تو مجھے ان پر بڑا ترس آتا تھا ۔ اور میں نماز پڑھ کر دعا مانگتی تھی کہ پروردگار بوا کے حج کرنے کا ارمان پورا کر دے ۔ انھوں نے تو محلے ٹولے والوں کے ارمان پورے کئے تھے ۔ ان کا تو بس یہی ایک ارمان ہے ۔ اسے پورا کر دے ۔

بھائی جان اور آپا بوا کے حج کرنے کے لئے اکثر پیسے بھجواتے رہتے ۔ میں بھی اپنی تنخواہ سے ہر ماہ انھیں کچھ روپئے دیتی تھی ۔ اس بار بوا کا جانا بھی بالکل طے تھا ۔ ابا نے دوڑ دھوپ کر کے پاسپورٹ بنوا لیا تھا ۔ اور ساری ضروری کارروائیاں مکمل کر لی تھیں ۔ بوا بھی ہنسی خوشی اپنے جانے کے انتظامات میں مصروف تھیں ۔ کبھی کنگھیاں خرید کر لا رہی ہیں ۔ کبھی کپڑے درست کر رہی ہیں ان کی مصروفیت دیکھ کر سب کو اطمینان ہو گیا تھا کہ اس بار ہماری بوا ضرور حجن بی بن کر آئیں گی ۔

بوا ان دنوں کلو پر بھی بہت مہربان تھیں ۔ ڈانٹ ڈپٹ بھی برائے نام ہی کرتی تھیں ۔ اس کے

چھوٹے بچوں کو دو چار پیسے بھی پکڑا دیتی تھیں۔ اس کی بیوی کو چند پرانے کپڑے بھی عنایت کئے تھے۔ کلو بھی دوڑ دوڑ کر ہنسی خوشی ان کے کام کرتا تھا۔ اور دعائیں بٹورتا تھا۔

اس دن اچانک صبح ہی صبح ان کی آواز باورچی خانہ میں گونجنے لگی۔

"کیوں رے حرام خور۔ تو پھر شرارت کرنے لگا۔ آخر کب باز آئے گا اپنی حرکتوں سے۔ یہ سودا لایا ہے۔ یا اپنا سر۔ ایک بھی چیز گت کی نہیں ہے۔ کیا پکا کر کھلاؤں گی سب کو؟"

کلو مجرموں کی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔

"یہ بتا کہ آخر دن بہ دن تیری نیت میں آگ کیوں لگی جا رہی ہے۔؟ جو جو تیری عمر آ رہی ہے بے ایمانی بڑھتی جا رہی ہے۔"

"کیا کروں بوا۔ دو دو پہاڑ بیاہنے کو بیٹھے ہیں۔ چھوٹوں کا الگ خرچہ ہے۔ عیدن کی بات پکی ہو گئی ہے۔ اور پاس کوڑی نہیں۔ نیت خراب نہ ہو تو کیا ہو۔؟

اچھا ——— اس طرح چوری بے ایمانی کر کے لڑکی بیاہے گا؟ خدا تجھے غارت کرے نمک حرام۔ چل دور ہو نظروں کے سامنے سے۔ منھ کالا کر اپنا۔"

کلو جلدی سے باہر کھسک گیا۔ سوچ رہا تھا کہ ناحق بوا سے اپنا دکھ درد کہدیا۔ اب بڑھیا ایک کی اٹھارہ بیگم صاحب سے لگائے گی۔ جو روکھی سوکھی ملتی ہے وہ بھی جائے گی۔

دو چار دن تک بوا کا موڈ کلو سے بہت خراب رہا۔ سیدھے منھ اس سے بات بھی نہیں کرتی تھیں۔ اور اسکی چوری چکاری کے بکھان بھی خوب زور و شور سے کرتی تھیں۔ کلو ان کے سامنے جانے سے بھی کتراتا تھا۔ لیکن پھر کام کے لئے تو ان کے پاس جانا ہی پڑتا تھا اور فضیحتا بھی سننا پڑتا تھا۔

ایک دن بوا حسب سابق مجرموں کی طرح اماں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ اماں ان کے لئے ہٹواسی رہی تھیں۔

"کیا بات ہے بوا؟" اماں نے پوچھا۔

بوا نے بے دھڑک کہہ دیا۔ "دلہن بیگم! ہمارے پیسے دیدو۔"

اماں اچھل پڑیں۔ اور خفگی سے بولیں۔ کیوں دیدوں؟

"کام ہے"۔ بوا نے بڑی رسانیت سے جواب دیا۔ عموماً ایسے موقعوں پر وہ ایسی نرم گفتار ہو جاتی

تھیں ۔ کہ مخاطب پسیجے بغیر نہیں رہتا تھا۔ لیکن اس بار اماں پسیجنے کے بجائے غصے سے بھڑک اٹھیں ۔ ” حج سے بڑا بھی کوئی کام ہے ۔؟“

” ہاں !“ بوا کا لہجہ پختہ تھا۔

” وہی تو میں بھی پوچھ رہی ہوں“ اماں ضبط کا دامن چھوڑ کر بیحد غصے سے بولیں ۔

” وہ اپنا کلوا ہے نا دلہن بیگم !“

” ہاں ۔ پھر کیا ہوا اسکو ۔ آج کل اس سے تم خفا تو بہت ہو۔ کیا کوئی غلطی ہو گئی ہے اس سے“

” نہیں بی بی ! اسکی لڑکی عیدن کی بات پکی ہو گئی ہے۔ تاریخیں تک ٹھہر گئی ہیں ۔ بیچارہ کلوا رو رہا ہے۔ اسکی جورو الگ دہائی ڈالے ہے کہ بیاہ کا انتظام کہاں سے ہوگا ۔ ! دلہن بیگم پیسے دیدو۔ تو کلوا کو دے آؤں ۔ غریب کی لڑکی بیاہ جائے ۔ میرا کیا ہے ۔ تم لوگ سلامت رہو ۔ حج تو پھر بھی کر آؤں گی ۔ لیکن کلوا کی بیٹی کا بیاہ رک گیا تو پھر نہیں ہوگا۔“

بوا کی بات سے اماں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں ۔ انھوں نے پیسے لاکر ان کے حوالہ کر دیئے ۔

” دلہن بیگم ! ہم سے خفا تو نہیں ہو ۔“

” نہیں بوا ۔“ اماں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

” تم اطمینان رکھو دلہن بیگم ۔ انشاء اللہ اگلے سال میں حج ضرور کر لوں گی ۔ اپنے رسولؐ کے روضہ کی زیارت کئے بغیر تو میرا دم بھی نہیں نکلے گا۔ اللہ اپنے گھر کبھی تو بلائے گا۔“

بوا روپئے لے کر باہر چلی گئیں ۔ میں نے سوچا ! پروردگار ۔ تو بڑا منصف ہے ۔ بوا نے لڑکیوں کی شادی پر کتنی فراخدلی سے اپنے جمع جتھا روپئے دے دیئے ۔ کیا تو انھیں ایک حج کا بھی ثواب نہیں دیگا ۔؟ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے نہ جاکر بھی کتنے حج کا ثواب حاصل کیا ہے ۔ ورنہ ۔ ورنہ شائد غریبوں کی لڑکیاں بیٹھی رہ جاتیں ۔ اور بوا کا حج ——— ان کے جی کو نہ لگتا۔

رشتوں کا جنم

مونا دوائیں اور پھل وغیرہ لے کر بازار سے واپس آئی تو اسکی امی تنہا نہیں تھیں ۔ایک مہمان بیٹھے ہوئے تھے ۔اس سے پہلے اس نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا ۔اس نے اجنبی کو سلام کیا ۔اور سامان رکھتے ہوئے بولی ۔

"امی معاف کیجئے گا مجھے بہت دیر ہوگئی"۔

"کوئی بات نہیں مونا ۔ ان سے ملو ۔ کافی عرصہ پہلے یہ میرے پڑوسی تھے ۔ عابد علی ان کا نام ہے ۔اور اب نیرو بی میں رہتے ہیں"۔

"انکل میں آپ کے لئے چائے لے آؤں ۔ آج ہماری ملازمہ چھٹی پر ہے ۔ اچھا ہوا کہ آپ آگئے ۔ ورنہ امی تنہا رہتیں"۔

مونا چائے بنانے چلی گئی ۔ عابد نے مسکرا کر کہا ۔

"ثمینہ ! ماشاءاللہ مونا تو بہت بڑی ہوگئی ۔ وقت کتنی جلدی گذر گیا ۔ جو کل بچے تھے ۔ وہ جوان ہیں جو کل جوان تھے ۔وہ بڑھاپے کا خیر مقدم کر رہے ہیں ۔ وقت کی رفتار کا ہم ہی ساتھ نہ دے سکے ۔ پیچھے رہ گئے ۔ ثمینہ ! ماضی کی یادیں کبھی کبھی اتنی تکلیف دہ ہو جاتی ہیں کہ جی چاہتا ہے ان سے اپنے سارے رشتے اور تعلق ختم کریں ۔لیکن یہ ہمارے بس میں کہاں ہے ۔؟

"تم اپنے بارے میں بتاؤ ۔ کب واپس آئے ۔ اتنے برسوں تک کہاں لاپتہ رہے ۔ کوئی خیر خبر ہی نہیں ملی ۔ بچے کتنے ہیں ۔ بیوی کیسی ہے ۔ سب کو ساتھ لائے ہو یا اکیلے ہی چلے آئے ہو ۔"؟

"سوچ رہا ہوں تمہارے سوالوں کا کیا جواب دوں ۔ شادی نہیں کی — اس لئے بیوی بچوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔"

"کیوں ؟ شادی کیوں نہیں کی عابد"؟

"ثمینہ! تم ماضی سے آنکھیں نہ چراؤ۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو، وقت کے سینے پر ان گنت نشان ہیں۔ اور ہر نشان میں ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ ایک داستان چھپی ہے۔ ماضی ہی تو ہمارا مشترکہ اثاثہ ہے۔"
"عابد! اِن باتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ، جنھیں دہرانے سے دکھ کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔"
"تو اب تک کون سی خوشیوں کی سوغاتیں ملتی رہی ہیں۔ دل میں اتنے زخم ہیں جن کا شمار ناممکن ہے۔ میری خطا صرف اتنی تھی کہ ذرہ ہو کر آسمان پر چمکنے والے درخشاں ستارے کی تمنا کر بیٹھا تھا۔ اور اس جرم کی پاداش میں اب تک ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔"
"وقت کا مرہم تو ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے عابد! کیا تمہارے زخم ......!"
"کچھ زخم ایسے ہوتے ہیں جو مندمل ہونے کے بجائے وقت کے ساتھ اور گہرے ہو جاتے ہیں۔"
عابد کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ ثمینہ تڑپ اٹھی۔
"عابد! لڑکی کا فرض ہے والدین کی مرضی کے آگے سر جھکانا، لیکن کبھی کبھی فرض کی ادائیگی میں اسکی ساری زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ پاپا کا انتخاب ان کی نظر میں بہترین انتخاب تھا۔ نعیم میں ہر وہ وصف تھا جو والدین اپنی لڑکی کے شریک حیات میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ دولت تعلیم اور ایک اچھی جاب اس لئے نعیم کو پسند کرتے وقت انھوں نے یہی ساری باتیں دیکھیں۔"
"یقیناً نعیم ہر طرح مجھ سے بہتر تھا۔ اپنی محرومی کے باوجود مجھے یہ اطمینان تھا کہ تم خوش ہوگی۔ لیکن یہاں آنے کے بعد پتہ چلا کہ تم اپنی بچی کے ساتھ تنہا رہتی ہو۔ وہ کون سے حالات تھے۔ جو تمہیں شوہر سے الگ رہ کر زندگی گذارنا پڑی ہے؟"
"شاید میں نعیم کے معیار پر پوری نہیں اتری۔ انھیں ہر شام کلب جانے کی عادت تھی اور کلب کے ماحول میں میرا دم گھٹتا تھا۔ مصنوعی چہرے، مصنوعی باتیں، بیہودہ مذاق اور پھر ہر مرد اور عورت کے ہاتھوں میں شراب کا جام۔ میں اس ماحول میں نہ کھپ سکی۔ میں نے کلب جانے سے انکار کر دیا۔ نعیم کے دوستوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ نعیم مجھ سے خفا ہو گیا۔ مجبوراً مجھے نعیم کو منانا پڑا۔ مجازی خدا جو ٹھہرا۔ نئے سال کی رات کلب میں خاص پروگرام تھا۔ نعیم نے ساتھ چلنے کی ضد کی۔ اس کی خوشی کی خاطر میں چلی گئی۔ ڈانس، گانا، قہقہے۔ اور شراب اس رات کلب میں ہر طرف مسرتیں بکھری ہوئی تھیں میں اپنی میز پر بیٹھی کوکاکولا کے گھونٹ لے رہی تھی۔ نعیم کئی لڑکیوں کے ساتھ ڈانس کر چکا تھا۔ اور نہ جانے

کتنے پیگ چڑھا چکا تھا۔ رات کے بارہ بجے لائٹ آف ہوگئی اور فضا مسرت بھری چیخوں سے گونج اٹھی ——— اندھیرے میں کسی نے میرا ہاتھ تھاما اور گھسیٹ لیا۔ میں سمجھی نعیم ہے۔ کاریڈور کی ہلکی سی روشنی میں میں نے ظفر ملک کو دیکھا تو جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا۔ اور غصے سے چلائی۔

"ظفر صاحب آپ ہوش میں تو ہیں ——؟ میں نعیم سے آپکی شکایت کرونگی"۔

ظفر ملک نے ایک قہقہہ لگایا اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھکر بولا۔

"ڈارلنگ! تم بہت بھولی ہو۔ میری بیوی اس وقت نعیم کے ساتھ ہے۔ آج کی رات ہم نے بخوشی ایک دوسرے سے بیویاں بدل لی ہیں۔ اس میں بہت لطف آتا ہے ڈیر۔ ذرا سوچو تو کہ ———"

میں غصے میں آپے سے باہر ہوگئی۔ چٹاخ سے اسکے منہ پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ بھاگی ہوئی باہر آئی ڈرائیور کو جگایا اور گھر آگئی۔ ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ صاحب کو لے آئے۔ نعیم نجانے کتنی رات گئے واپس آیا۔ میں اپنا کمرہ اندر سے بولٹ کرکے لیٹی تھی۔ اس رات مجھے ایک لمحہ کے لئے نیند نہیں آئی۔ اور میں نے ایک اہم فیصلہ کر ڈالا۔ میں صبح نعیم کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اپنا سامان لیکر گھر چلی آئی۔ اس وقت مونا صرف چھ ماہ کی تھی۔ میں نے پاپا سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کسی قیمت پر نعیم کے ساتھ نہیں رہ سکتی رات کا واقعہ بھی ان کے گوش گذار کر دیا۔ پاپا کو بہت غصہ آیا۔ وہ نعیم کو اس حد تک گرا ہوا نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے میرے اوپر کبھی نعیم کے گھر جانے کا دباؤ نہیں ڈالا۔

"نعیم نے میل ملاپ کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد ایک نیکی ضرور کی۔ مجھے طلاق دیدی اور میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ پھر میری زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا ——— ننھی مونا کی پرورش پچھلے سال پاپا بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ان کے بعد ہم بہت تنہائی محسوس کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ اسکے بھی عادی ہو چلے تھے۔ کہ ایک نئی مصیبت آگئی۔ میری بیماری"۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی ثمینہ! بیماری تو آتی جاتی رہتی ہے"۔

"کچھ بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جو ایک بار آنے کے بعد نہیں جاتیں اور جاتی بھی ہیں تو مریض کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاتی ہیں"۔

ثمینہ کا لہجہ دھیما ہوگیا۔ عابد پریشانی کے لہجہ میں بولا۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں ——؟"

"کینسر ——— اور آپریشن ——— ابھی یہ بات مونا کو نہیں معلوم ہے۔"

"ثمینہ ——— یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔؟" عابد نے تڑپ کر اسکے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ بس مجھے مونا کی فکر ہے۔ وہ ابھی بچی ہے۔ دنیا کے مکروفریب سے ناآشنا ہے۔ اس نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی ہے۔ بن باپ کی بچی اب بن ماں کی بھی ہو جائے گی۔"

ثمینہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"دنیا کبھی کبھی بہت بے رحم ثابت ہوتی ہے ثمینہ! اس کی بے رحمی کا ایک بار اس وقت شدت سے احساس ہوا تھا جب ——— جب تمہارے پاپا نے مجھے صرف اس لئے نظر انداز کر دیا تھا کہ میں ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ ایسے میں وہ میری محبت کی قدر کیا کرتے۔ اور میں اتنا دل برداشتہ ہوا کہ ملک چھوڑ کر افریقہ چلا گیا۔ برسوں مارا مارا پھرا۔ پھر نیروبی میں مستقل بس گیا تمہارے پاپا کی لگائی ہوئی ٹھوکر کی چوٹ تازہ تھی۔ اور اس چوٹ نے میرے اندر دولت پیدا کرنے کی دھن پاگل پن کی حد تک پیدا کر دی۔ دولت بڑھتی گئی لیکن اس میں سکون نہ ملا۔ ایک بار پھر جی گھبرایا تو ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں آ کر تمہاری زندگی کے المیہ کا علم ہوا ——— سوچا تم سے تم ہی کو مانگ کر اپنی اندھیری زندگی میں اجالے بھر دوں۔ اب ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے لیکن دنیا نے ایک بار پھر اپنے بے رحم ہونے کا ثبوت دیا ——— تمہیں یہ مرض دیکر۔ لیکن میں اب بھی ہمت نہیں ہارا ہوں۔ میں تمہارا بہترین علاج کراؤں گا۔ جو کچھ ممکن ہوگا کروں گا۔ آگے میری قسمت۔"

عابد نے اسکے ہاتھوں کو چوم لیا۔ ثمینہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایسا چاہنے والا تو قسمت ہی سے ملتا ہے۔ لیکن تقدیر اپنا کھیل کھیل جاتی ہے۔

مونا چائے لیکر آ گئی۔ سب نے چائے پی اور عابد ڈاکٹر بخش سے ملنے چلا گیا۔ تاکہ ثمینہ کے علاج کے بارے میں ان سے تبادلۂ خیال کر سکے۔

عابد نے ثمینہ کو آپریشن کے لئے جرمنی لے جانے کا پورا انتظام کر لیا۔ مونا بھی ان کے ساتھ جا رہی تھی۔ اور اب اسے بھی ماں کی بیماری کا علم ہو چکا تھا۔ اس کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ ماں

کے سوا اسکا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ موت کے فرشتے کی آہٹیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ ثمینہ اور عابد اسکی ہر طرح دلجوئی کرتے۔ لیکن ماں کی جدائی کا اسے یقین سا ہو گیا تھا۔ وہ ہر وقت ماں کے قریب رہتی اور ان کی صورت تکتی رہتی۔

وہ لوگ بخیریت جرمنی پہنچ گئے۔ اور جب ثمینہ کو آپریشن تھیٹر میں لے جانے لگے۔ تو اس نے مونا کا ہاتھ عابد کے ہاتھ میں دیکر کہا۔

"عابد! —— مونا کو تمہارے حوالہ کر رہی ہوں۔ پرانے رشتوں سے نئے رشتے جنم لیتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ تم مونا کو اپنا لو۔ تمہارے سوا مجھے کسی پر بھروسہ نہیں ہے۔ — خدا حافظ"۔

مونا رونے لگی۔ عابد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔ اور پروردگار سے ثمینہ کی زندگی دعا مانگنے کی نصیحت کی۔

ثمینہ آپریشن تھیٹر میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹر اپنا کام کر رہے تھے۔ اور باہر مونا ایک کرسی پر نڈھال سی پڑی تھی۔ عابد بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ وہ اس وقت سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ثمینہ کا واضح اشارہ وہ سمجھ چکے تھے۔ لیکن پرانے رشتے انھیں اتنے عزیز تھے۔ کہ انھیں فراموش کرکے نئے رشتے استوار کرنے کی بات وہ سوچ ہی نہ سکتے تھے۔ پھر بھی انھوں نے یہ فیصلہ ضرور کر لیا تھا کہ اپنی ساری زندگی مونا کی خوشیوں کے لئے وقف کر دیں گے۔

آپریشن کامیاب ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے یقین دلایا تھا کہ ثمینہ کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی کی طرح نارمل زندگی گذار سکے گی۔ سینے کی گولائی کی جگہ سپاٹ تھی اور بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔ آپریشن کے بعد تقریباً ڈیڑھ مہینے وہ لوگ وہاں رکے۔ پھر ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق دوائیں اور انجکشن وغیرہ ساتھ لیکر ہندوستان واپس آ گئے۔

ثمینہ کئی مہینے تک فرسٹریٹڈ (FRUSTRATED) رہی۔ رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگی۔ مونا اور عابد نے اسکی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیئے۔ اس دوران مونا اور عابد نے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا وہ ایک دوسرے کو پسند بھی کرنے لگے تھے۔ کبھی کبھی وہ تینوں سیر و تفریح کے لئے بھی جاتے تھے۔ دیکھنے والے انھیں ایک خاندان کے افراد سمجھتے تھے۔ ثمینہ کو ان دنوں جس ذہنی رفاقت کی ضرورت تھی۔ اسے عابد نے پورے خلوص اور محبت سے پورا کیا تھا۔

ایک شام وہ تینوں لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اچانک عابد نے پوچھ لیا۔
"ثمینہ! تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟"
"سوچنا کیا ہے۔ زندگی جس طرح گذر رہی ہے۔ گذرتی رہے گی۔ البتہ اس نئی زندگی کا ہر لمحہ، ہر پل تمہارا بخشا ہوا عطیہ ہے۔ جس کے لئے میں آخری سانس تک تمہاری احسانمند رہوں گی۔"
"صرف احسانمندی سے کام نہیں چلے گا۔" عابد مسکرائے۔
"پھر ـــــ؟" ـــــ ثمینہ نے حیرت سے پوچھا۔
"کوئی خوبصورت اور قیمتی تحفہ۔ بلکہ انعام دینے کا وعدہ کرو۔"
"میرے پاس میری بچی مونا کے سوا کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔ اسے تو میں پہلے ہی تمہارے حوالہ کر چکی ہوں۔"
"مونا سمجھدار ہے۔ اسے بھی کوئی فیصلہ کرنے کا حق ہے ثمینہ۔"
"تو کیا مونا نے بھی کوئی فیصلہ کیا ہے؟"
"ہاں! بلکہ اس کے فیصلہ میں میری خوشی اور رضامندی کو بھی دخل ہے۔"
"مجھے بھی تو بتاؤ۔"
"وہ یہ کہ مونا اب مجھے ابو کہے گی۔ انکل نہیں۔ اور میں سچ مچ اسے اپنی بیٹی بنا رہا ہوں۔ تمہی نے تو کہا تھا کہ پرانے رشتوں سے نئے رشتے جنم لیتے ہیں۔"
ثمینہ نے مونا کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ بہت ہشاش بشاش تھی اور مسکرا رہی تھی۔ ثمینہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور سسک پڑی۔
"یہ کیا ثمینہ! ـــــ؟" ـــــ عابد نے اسکے ہاتھ ہٹائے اور مونا نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور منت بھرے لہجے میں بولی۔
"امی! آپ نے مجھے ہر خوشی، ہر سکھ دیا۔ لیکن بس ایک سکھ نہ دے سکیں۔ وہ آپ کے بس میں تھا بھی نہیں۔ اور میں بن باپ کی بچی بن کر جیتی رہی اب یہ کمی ابو پوری کر رہے ہیں تو آپ کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔"
ثمینہ نے ایک ہاتھ سے اسے لپٹا لیا۔ اور دوسرا ہاتھ عابد کے ہاتھ میں دیدیا۔ جسے اسنے مضبوطی سے تھام لیا ـــــ سچ مچ، نئے رشتے جنم لے چکے تھے۔

بیساکھیاں

شبو میاں نے مسجد سے گھر تک کا راستہ بڑی مشکل سے طے کیا .... اور پھر ڈیوڑھی میں پڑی ہوئی پرانی چوکی پر بیٹھ کر سستانے لگے۔ چند قدم کا فاصلہ بھی اب تو میلوں لمبا معلوم ہوتا تھا۔ جوڑوں کا درد کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اب تو ہر سال جاڑوں میں اس تکلیف کو جھیلنا پڑتا تھا۔ خون کی گرمی بھی بتدریج ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اور اسکے بجائے شریانوں میں ٹھنڈا سیال بہنے لگا تھا۔ شائد یہی سیال جوڑوں کے آس پاس جم کر کسی ٹھوس چیز میں تبدیل ہو جاتا تھا اور جسم کے سارے جوڑ کچھ اس طرح سخت ہو جاتے تھے کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

شبو میاں گھٹنوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوئے اور دھیرے دھیرے اندر کی سمت بڑھے "جمال کی امی" ـــــــ انھوں نے آواز دی۔ اور دالان میں بچھے ہوئے تخت پر بیٹھ گئے، پیروں کو بدقت کھینچ کر تخت پر پھیلایا۔ اتنی سخت مشقت اور تکلیف سے وہ تھک سے گئے تھے۔ سانسیں ناہموار ہو رہی تھیں۔ چہرے کی اجلی رنگت میلی ہو رہی تھی۔

صالحہ بیگم دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آئیں شائد وہ باورچی خانہ میں مصروف تھیں۔

"آگ جل رہی ہو تو انگیٹھی مجھے دیدو، ذرا پیر سینکوں گا۔"

"کیا بہت تکلیف ہے؟" صالحہ بیگم پریشان ہو گئیں۔

"نہیں معمولی سی ہے۔" شبو میاں نے بیوی کی پریشانی کے خیال سے جھوٹ کا سہارا لیا یونہی بیچاری کو کون سا سکھ مل رہا تھا۔ جو اپنے دکھ درد بتا کر ان کو مزید پریشان کریں۔ پھر دکھ بھی ایسا جو اب زندگی ہی کا ایک حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ اور جس کا علاج نہ ان کے پاس تھا نہ صالحہ بیگم کے پاس۔ صالحہ بیگم ان کی دن بدن گرتی ہوئی صحت سے فکرمند رہتی تھیں۔ اسوقت جو ان کو اس طرح بے حال دیکھا تو محبت بھرے لہجے میں کہنے لگیں۔

"اب آپ کل سے مسجد نہ جایا کیجئے۔ گھر ہی میں نماز پڑھ لیا کیجئے۔"

"بیگم اسی بہانے گھر سے دو چار بار باہر نکلتا ہوں تو محلے والوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ذرا جی ہی بہل جاتا ہے۔ گھر میں پڑے پڑے تو اور طبیعت گھبرانے لگتی ہے۔"

صالحہ بیگم نے انگیٹھی تخت کے قریب رکھدی اور خود پیڑھی پر بیٹھ کر ان کے پیر سینکنے لگیں۔

"جمال کا خط آج بھی نہیں آیا۔" صالحہ بیگم نے کہا اور تہہ کیا ہوا کپڑا گرم کر کے ان کے گھٹنے پر رکھ کر اپنے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

شبو میاں نہ جانے کن خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ بس 'ہوں' کر کے رہ گئے۔ وہ بھی خاموشی سے سنکائی کرتی رہیں۔ کچھ آرام ملا تو شبو میاں نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں منع کر دیا...... اور تکیہ سرہانے رکھ کر لیٹ رہے۔ رضائی سینے تک اوڑھ لی ..... ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔

صالحہ بیگم انگیٹھی لے کر چلی گئیں۔ ابھی انھیں شوہر کے لئے دلیہ پکانا تھا۔ رات کا کھانا جب سے چھوٹا تھا وہ انھیں زبردستی شام کی چائے کے ساتھ کچھ کھلا پلا دیتی تھیں۔ بوڑھی ہڈیاں ایک وقت کے کھانے کے سہارے کب تک چل سکتی تھیں؟

ان کے اوپر تلے چار بچے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے تب جمال پیدا ہوا۔ پروردگار نے اسے صحت اور زندگی عطا کر کے گویا انھیں از سر نو زندگی بخش دی تاہم ان کی محبت اور ممتا کے اظہار میں بیجا لاڈ و پیار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے برعکس انھوں نے جمال کی پرورش اور تربیت ایک خاص ڈھنگ سے کی۔ وہ مطمئن تھے کہ ان کا اکلوتا بچہ مستقبل میں ان کا سہارا بنے گا۔ اور زمانہ کی روش سے خود کو الگ رکھے گا...... ان کے جاننے والوں میں کئی بدنصیب والدین تھے جن کے بیٹے چار پیسے کماتے ہی اپنی گرہستی الگ کر بیٹھے تھے۔ کم از کم انھیں جمال سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ ابھی تک ان کا فرمانبردار تھا...... لیکن ان کی یہ خوش فہمی تادیر قائم نہ رہ سکی اور جمال خود کو وقت کے دھارے سے الگ نہ رکھ سکا اور ایک دن بلا جھجک اپنے والدین سے اپنی خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔

"ابّو! میں سعودی عرب جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں بیٹا! تم کو اتنی دور جانے کی کیا سوجھی؟" شبو میاں نے مسکرا کر بات ٹالی۔

"اس لئے کہ یہاں کوئی اچھی ملازمت تو ملنے سے رہی وہی تین چار سو روپلی پر ساری عمر گھس گھس کرتے رہیں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ تمہارا خیال درست ہو۔ لیکن چند پیسوں کی خاطر میں تم کو اتنی دور جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ پھر اب ہم بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

"ابو آپ کس دنیا میں رہتے ہیں۔ میں چند پیسوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ ہزاروں ریال کی بات کر رہا ہوں جن سے زندگی کی ساری خوشیاں خریدی جا سکتی ہیں۔"

جمال نے باپ کی ناسمجھی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! ہمیں تو تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم ہماری نظروں کے سامنے رہو گے تو سمجھو ہمیں ساری خوشیاں مل گئیں۔" ماں نے تڑپ کر کہا۔ وہ غریب اب بھی اپنی خوشیوں کو بیٹے سے وابستہ کرنے پر بضد تھی۔ اور اسکی ناسمجھی پر جمال کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔ وہ ان کو کس طرح سمجھائے کہ وہ اپنی اور صرف اپنی خوشیوں کا ذکر کر رہا ہے۔ جس زندگی کے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس میں پرانی قدروں سے چپٹے رہنے والے ان بوڑھے اور نادان والدین کے لئے کوئی جگہ نہیں ـــــــ کوئی ٹھکانہ نہیں ـــــــ انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب وہ جس طرح جی چاہے زندگی گذارے اور اب اس نے بڑے صاف اور سلجھے ہوئے الفاظ میں اپنا فیصلہ ان کے گوش گذار کر دیا۔

"میں آپ لوگوں کی خاطر اپنی زندگی اور اپنا مستقبل برباد نہیں کر سکتا۔ میرے دوست ارشد نے ٹکٹ اور ویزا بھیج دیا ہے۔ میں اگلے ہفتے بمبئی جا رہا ہوں۔ وہاں سے ریاض چلا جاؤں گا۔ مجھے ایک تجارتی فرم میں بڑا اچھا جاب (ملازمت) مل گیا ہے۔

ماں باپ حیرت اور افسوس سے اسکا منھ دیکھ کر رہ گئے۔ کتنی ناقابل یقین بات تھی کہ جمال نے ان کی خوشی، ناخوشی کی پروا کئے بغیر ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جو کل تک ان کی انگلی پکڑ کر چلتا تھا آج کتنے اعتماد اور غرور سے کہہ رہا ہے کہ ان کی خاطر اپنی زندگی اور اپنا مستقبل برباد نہیں کر سکتا۔ ان کا بیٹا کتنا عقل مند اور دور اندیش ہے جو ہوش سنبھالتے ہی اپنی زندگی اور مستقبل کی فکر کرنے لگا۔ اس کے مقابلے میں وہ سچ مچ کتنے بے وقوف ہیں جو عمر کی کسی منزل پر بھی اپنے مستقبل کی فکر نہ کر سکے۔ الٹے اپنی ساری زندگی بیٹے سے وابستہ کر کے مطمئن ہو گئے ـــــــ اب عقلمند اور دور اندیش بیٹا ایک سنہری مستقبل کو گلے لگانے کے لئے سارے فرسودہ اور فضول سے رشتے ناطے توڑ کر بڑے طمطراق سے سمندر پار جا رہا ہے ـــــــ ان کی آنکھوں میں بھی سمندر کا نمکین پانی بھر گیا جس

کے آگے سب کچھ دھندلا گیا۔

صالحہ بیگم کی سسکیاں سن کر شبو میاں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ انکی پشت پر رکھ دیا۔ تسلی کا یہ پرخلوص اور خاموش انداز اپنے اندر ہزاروں تکلم چھپائے ہوئے تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھا ـــــ جو ہر بچے کی موت پر اسی طرح ان کو تسلی دیتا رہا تھا ـــــ اب ـــــ اب ہزاروں منتوں مرادوں اور شب وروز کی عبادتوں کے صلے میں ملنے والی اولاد کی جلاوطنی پر بھی وہ اسکی پشت سہلاتے ہوئے خاموش زبان سے انھیں دلاسہ دے رہا تھا ـــــ بہلا رہا تھا ـــــ!

جمال چلا گیا ـــــ اور اتنے بڑے ڈھنڈھار گھر میں وہ دونوں رہ گئے۔ اور در و دیوار سے لپٹی ہوئی یادوں کی پرچھائیاں ـــــ ان پرچھائیوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے شبو میاں نے مکان کا آدھا حصہ کرایہ پر اٹھا دیا۔ اور آدھا رہائش کے لئے رکھ لیا۔ بیٹے کے سعودی ریال تو نہ جانے کس بینک میں جمع ہو رہے تھے۔ البتہ جب کبھی بھولے بھٹکے جمال کا کوئی خط آجاتا تھا۔ تو شبو میاں ڈاکئے کو انعام کا روپیہ دینا نہیں بھولتے تھے اور شائد یہ اسی ایک روپیہ کی برکت تھی کہ ڈاکیہ نے محلے میں مشہور کر دیا تھا کہ شبو میاں کا بینک بیلنس دن رات بڑھ رہا ہے۔ جمال ہر ہفتہ ڈرافٹ بھیجتا ہے۔

شبو میاں تو پڑوسیوں کی مبارکباد بھی خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے کہ مبادا یہ بھرم ختم ہو جائے۔ اور جو لوگ ان پر رشک کرتے ہیں۔ اٹا ترس کھانے لگیں۔

جب سے عرب ممالک کے تیل کے ذخیروں نے ہونہار لڑکوں کو اپنی طرف کھینچا تھا لڑکیوں کے والدین بھی ایک ایک سے لڑکوں کا اتا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ جو عرب ممالک میں ملازمت کرتے ہوں۔ اور لڑکیاں بھی امریکہ اور انگلینڈ ریٹرن لڑکوں کے مقابلے میں انھیں کو زیادہ اہمیت دیتی تھیں ـــــ جمال کے گھر پر بھی لڑکی والوں نے دھاوا بول رکھا تھا۔ پرانے رشتوں کی از سر نو تجدید ہو رہی تھی۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قرابت کا سلسلہ جوڑا جا رہا تھا۔ اور ایک سے ایک اچھی لڑکی پیش کی جا رہی تھی۔

صالحہ بیگم نے دو چار بار بیٹے کو شادی کے لئے لکھا چند تصویریں بھی بھیجیں۔ لیکن وہ تو پیسہ کمانے کی دھن میں ایک کمپنی سے دوسری کمپنی ـــــ اور ایک شہر سے دوسرے شہر کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ ایسے میں اسے شادی کا خیال کیسے آتا ـــــ وہ تو پیسے کی طمع میں یہ بھی

بھول گیا تھا کہ اسکے بوڑھے والدین کو اس وقت اسکی کتنی ضرورت ہے۔

صالحہ بیگم نے شوہر سے چھپا کر بیٹے کو سارا حال لکھ دیا۔ شبو میاں کی پیروں کی تکلیف علاج اور غذا کی کمی۔ اور آخر میں یہ بھی تحریر کر دیا کہ اب تو وہ چھڑی کے سہارے کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے اگر چند مہینے یہی حال رہا تو وہ ضرور پلنگ پکڑ لیں گے۔

صالحہ بیگم کو یقین تھا کہ باپ کا حال پڑھ کر جمال ضرور گھر واپس آجائے گا۔ نہ آسکا تو کم از کم اتنا پیسہ ہی بھیج دیگا کہ باپ کا معقول علاج ہو سکے۔ محلے کے حکیم صاحب بھی مالش کے لئے تیل بنا کر دیتے دیتے اکتا چکے تھے۔ اب تو ان کی وجہ سے حکیم صاحب کی ساکھ پر بھی اثر پڑنے لگا تھا کیونکہ ان کے پیروں کی تکلیف کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب کے علاج کا بھی ذکر ضرور آتا تھا۔ اور علاج کی ناکامی کا تذکرہ زیر بحث آتا تو یہ حکیم صاحب کے حق میں برا ہوتا۔ اسلئے حکیم صاحب نے اپنا آخری فیصلہ محفوظ رکھنے کے بجائے صاف صاف ان کے گوش گذار کر دیا تھا کہ یہ درد تو دم کے ساتھ جائیگا اور اس درد کا نام انھوں نے خالص یونانی زبان میں اتنا لمبا چوڑا بتایا تھا۔ جسے سنکر شبو میاں نے مختصراً مرض الموت کا نام دے دیا تھا۔ اور اپنی قسمت سے زیادہ اپنی چھڑی پر شاکر ہو گئے تھے۔

کافی عرصہ کے بعد جمال کا خط آیا اس نے لکھا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست کے ہاتھ کچھ سامان بھجوا رہا ہے۔ شبو میاں اور صالحہ بیگم کو سامان سے زیادہ دوست کی آمد کی خوشی تھی جس سے وہ جمال کا حال احوال معلوم کر سکیں گے۔ جمال نے تو کبھی اپنے متعلق کوئی صحیح بات ہی نہیں لکھی تھی۔ کم از کم وہ اسکی خوشحالی اور ترقی کا ذکر سن کر خوش ہولیں گے۔ کہ وہ بیٹے کے دشمن نہیں اس کے سب سے زیادہ چاہنے والے دوست ہیں۔

جمال کا دوست آگیا۔ شبو میاں چھڑی کا سہارا لیکر بیٹھک میں آئے اور بڑے شوق و محبت سے نوجوان کو گلے سے لگایا۔ پھر اسے اپنے سامنے بٹھا کر چند منٹ سراپا دیکھتے رہے۔ شائد دل ہی دل میں اپنے جمال کے متعلق اندازے قائم کرنے لگے ہوں۔ کچھ خیال آیا تو اندر کھلنے والے دروازہ کی طرف منھ کر کے پکارا۔

"جمال کی امی! بھئی خوب عمدہ سی چائے بنا کر لاؤ۔ جمال میاں کے دوست آئے ہیں۔ اور بھئی ان سے پردہ وردہ نہیں چلے گا۔ جیسے جمال ویسے یہ ہیں ہمارے لئے۔

اپنی بات پر شبو میاں خود ہی ہنسنے لگے۔ نوجوان بھی مسکرادیا۔ اور ایک پیکٹ ان کی طرف بڑھادیا تو وہ بچوں جیسی معصومیت سے مسکرادیئے۔

"ارے میاں یہ مجھ سے تو کھلنے سے رہا۔ تم خود ہی کھول کر دکھادو۔"

نوجوان نے پیکٹ کھولا۔ چند میں کپڑے کے تھے۔ دو جوڑ گرم موزوں کے تھے۔ اور پھر اس نے فولڈ کی ہوئی اسٹیل کی خوبصورت بیساکھیاں کھول کر ان کے نزدیک رکھ دیں اور سادگی سے بولا۔

"یہ جمال نے خاص طور سے آپ کے واسطے بھجوائی ہیں۔ ان کے سہارے آپ بڑے آرام سے چل سکتے ہیں۔"

شبو میاں نے ایک پل جگ مگ کرتی بیساکھیوں کو دیکھا اور دوسرے پل جیسے ان کا بڑھاپا رخصت ہوگیا۔ پھرتی سے کھڑے ہو کر انھوں نے بیساکھیوں کو چھڑی کی نوک سے دور کھسکا دیا اور سخت لہجہ میں دھاڑے۔ "جمال سے کہہ دینا ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ والدین کا سہارا تو ان کی سعادت مند اولاد ہوتی ہے۔ اگر انھیں کی ضرورت ہوتی تو والدین بچوں کی تمنا کیوں کرتے۔؟

ساری زندگی کی پونجی لٹانے کے بجائے محض بیساکھیاں ہی نہ خرید لیا کرتے۔؟"

وہ مڑے ـــــــ اور پلٹ کر اندر چلے گئے۔

امام ضامن

میرا بیٹا گوتم پہلی بار گھر سے اتنی دور جا رہا تھا۔ ہم سب ہی اداس تھے۔ لیکن اس کے روشن مستقبل اور اچھی زندگی کے لئے ہمیں اسکی جدائی کا دکھ برداشت کرنا ہی تھا۔ انسان قربانی دیئے بغیر کچھ نہیں حاصل کر پاتا۔ اور یہ بات میں نے گوتم کی ماں کو بھی سمجھا دی تھی۔ ——— رہا گوتم ——— تو وہ ایک بہادر باپ کا بیٹا ہے۔ اور کافی سمجھدار بھی۔ اس لئے اس کو زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چند سال قبل تک میں ایک نڈر اور بے خوف فوجی افسر تھا۔ لیکن اب میں اندر سے ڈرا ہوا رہتا ہوں یہ ڈر اور خوف اس لئے نہیں ہے کہ میں نے جنگ میں اپنا ایک ہاتھ گنوا دیا ہے ...... یہ خوف اس لئے بھی نہیں ہے کہ میں جنگ سے گھبراتا ہوں۔ دشمن آمنے سامنے ہو تو لڑنے میں مزہ آتا ہے۔ اور خون گرم ہو کر رگوں میں اسطرح اچھلتا ہے۔ جیسے آتش فشاں میں لاوا کھولتا ہے۔ مجھے تو اس جنگ سے خوف آتا ہے جو ہمارے پر امن شہروں میں جگہ جگہ ہو رہی ہے اور دشمن ہماری نظروں کے سامنے ہونے کے باوجود ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتا ہے ...... میں تو ادھورا ہو کر بھی مکمل ہوں۔ کیونکہ میں نے ایک بڑے مقصد کے لئے جنگ کی تھی۔ اور اپنے ملک سے وفاداری اور محبت کے ثبوت میں ایک ہاتھ تو کیا اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے تو دکھ نہ ہوتا۔ دکھ تو ان کے لئے ہے جو مکمل ہو کر بھی نامکمل اور ادھورے ہیں۔ میں اس جنگ کے خلاف ہوں، جو بھائی بھائی سے کر رہا ہے۔ میں اس لڑائی سے نفرت کرتا ہوں ——— جو اپنے اپنوں سے کرتے ہیں۔ میں مذہب، نسل، زبان، اور فرقوں کے نام پر جنگ کرنے کو بزدلی سمجھتا ہوں ..... لیکن یہ جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے۔ ان دیکھے ہاتھ اس جنگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان ہاتھوں پر فاطمہ موسی کا دیا ہوا امام ضامن باندھ دوں اور تب ان سے پوچھوں کہ کیا اب بھی یہ ہاتھ جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ؟ بھائی کا گلا کاٹنے کے لئے آمادہ ہیں؟ اور کیا یہ ہاتھ اب بھی اپنوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی جرات کر سکتے ہیں۔ ؟

گوتم رخصت ہونے لگا تو میری تینی نے اپنے صندوقچے سے تانبہ کا پیسہ نکالا، اسے احترام و محبت سے آنکھوں سے لگایا۔ پھر ایک سکہ اس تانبہ کے پیسے سے مس کر کے ایک کپڑے میں سا سیا اور پھر بھگوان کا نام لیکر اسے گوتم کے داہنے بازو پر باندھ دیا۔

ہمیں اعتقاد ہے کہ امام ضامن کی موجودگی میں گوتم کو کچھ نہیں ہوگا۔ اور وہ بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جائیگا۔ اگر میرے بازو پر فاطمہ موسی نے امام ضامن نہ باندھا ہوتا تو شائد میں جنگ سے زندہ واپس نہ آتا۔ یہ فاطمہ موسی کی دعائیں تھیں جو میں اس میدان حشر سے واپس آیا تھا۔ اس طرح کہ میرے داہنے بازو پر امام ضامن بندھا ہوا تھا اور بایاں ہاتھ کہنی کے پاس سے کاٹ دیا گیا تھا۔ لیکن بہر حال میں زندہ اپنے گھر واپس آیا تھا۔ فاطمہ موسی کا یہ امام ضامن ہمارے گھر میں ویسا ہی پوتر سمجھا جاتا ہے جیسے گیتا۔

فاطمہ موسی میری پڑوسی تھیں۔ ان کا بیٹا خالد میرا کلاس فیلو تھا۔ فاطمہ موسی خالد کو بہت چاہتی تھیں کم سنی کی شادی اور پھر بیوگی نے ان کو یہی ایک تحفہ دیا تھا۔ اسے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتی تھیں اسکول جاتے ہوئے میں خالد کو اپنے ساتھ لے لیتا تھا۔ اور فاطمہ موسی اس کے ساتھ مجھے بھی اصرار اور پیار سے ناشتہ کراتی تھیں۔ اسکول سے واپسی میں خالد میرے گھر آجاتا تھا۔ ہم ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ اور کھیلتے کودتے تھے۔ فاطمہ موسی اس وقت اسکول میں ہوتی تھیں۔ اس ملازمت سے وہ اپنا اور خالد کا خرچ چلاتی تھیں۔ گھر پر بھی کچھ بچے کلام پاک پڑھنے آجاتے تھے مجھے فاطمہ موسی کا تلاوت کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ ان کے گلے میں سوز تھا۔ میں اکثر ان کے پاس بیٹھ کر انھیں تلاوت کرتے دیکھتا رہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے کلام پاک کی کئی سورتیں یاد ہو گئیں۔ اور اردو لکھنا پڑھنا بھی آگیا۔ میرے پتاجی اکثر میری ماں سے ہنس کر کہتے۔

"رکمنی! تجھے کچھ خبر بھی ہے؟ تیرا بیٹا مسلمان بنا جا رہا ہے۔ فاطمہ دیوی کی محبت اسے برباد کر رہی ہے۔"

میری ماں جواب دیتی۔

"تم ہماری لڑائی کرانا چاہتے ہو۔ لیکن یہ ہونے کا نہیں۔ میں نے اور دیدی نے ایک کٹورے میں دودھ چاول کھائے ہیں۔ لڑنا جھگڑنا تو تم مردوں ہی کی عادت ہے۔ جب دیکھو آئے دن جھگڑا

فساد ہوتا ہی رہتا ہے"۔

میں انٹر کے بعد ایر فورس کی ٹریننگ میں چلا گیا۔ خالد بھی میرے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن فاطمہ دیوی نے اسے اجازت نہیں دی۔ وہ جنگ سے بہت ڈرتی تھیں۔ لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ لڑائیاں صرف میدان جنگ ہی میں نہیں لڑی جاتیں۔ شہروں کے گلی کوچوں میں بھی لڑی جاتی ہیں۔ اور ایک دن ایسی ہی ایک لڑائی میں خالد کام آگیا۔ فاطمہ موسی کو تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کوئی اسطرح بھی مارا جا سکتا ہے۔

ایک چھوٹی سی بات کو لیکر شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اور پھر فساد کی یہ آگ محلے محلے پھیل گئی۔ خالد نے اپنے محلے والوں کے ساتھ ملکر ایک امن کمیٹی بنائی۔ اور سب ہندو مسلمانوں سے پُرامن رہنے کی اپیل کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا محلہ نفرت اور بربادی کی اس آگ سے پوری طرح محفوظ رہا۔ خالد کی کوششیں بار آور ہوئیں اور ہر فرقے کے لیڈر نے اس کی امن پسندانہ کوششوں کو سراہا۔ اور حکومت کے ذمہ داروں نے اسکی تعریف کی۔ لیکن شر پسندوں کو اسکی یہ کامیابی پسند نہ آئی۔ وہ تو ایسی ہر کوشش کو ناکام بنانے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ اور پھر انجام کار خالد کو چھرا مار دیا گیا۔ پتا جی نے مجھے سارے حالات لکھے تو میں چھٹی لیکر گھر آگیا۔ خالد میرا بہت پیارا دوست تھا۔ مجھے فاطمہ موسی کے دکھ کا بھی پورا احساس تھا۔ اور میں ان سے دل ہی دل میں بہت شرمندہ تھا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خالد کو میں نے ہی مار ڈالا ہو۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں فاطمہ موسی کا سامنا کر سکوں اور انھیں اپنی شکل دکھا سکوں۔

میں ان کے سامنے پہنچا تو میرا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا۔ فاطمہ موسی نے مجھے دیکھا تو اپنی باہیں پھیلا دیں اور مجھے سینے سے لگا کر رو پڑیں۔

"بیٹا مجھے معاف کر دو۔ میں تمہارے بھائی کی حفاظت نہ کر سکی۔ اسے موت کے منھ میں جانے سے نہ روک سکی"۔

آہ! ۔ وہ تو الٹے مجھ سے معافی مانگ رہی ہیں۔ جیسے خالد اس کا بیٹا نہیں۔ صرف میرا عزیز بھائی تھا۔ اسے تو مجھے گالیاں دینا چاہئے تھیں۔ برا بھلا کہنا چاہئے تھا کہ خالد کو جس نے مارا وہ میرا ہم نام تھا۔ لیکن فاطمہ موسی مجھے لپٹائے اس طرح رو رہی تھیں جیسے ان کے ہاتھوں میرا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہو۔ میں انھیں تسلی نہ دے سکا۔ غم سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ اور میں چیخیں مار مار کر رو رہا تھا۔ خالد کی موت کے غم پر ندامت اور پشیمانی کا احساس غالب آچکا تھا۔ موت تو برحق ہے فاطمہ موسی

کو بار ہا پڑھتے سنا تھا "کل نفسٍ ذائقۃ الموت" لیکن ایسی موت ؟ جس کا الزام ایک فرد پر نہیں پوری قوم پر آئے اس کا ازالہ ممکن ہی نہیں ہے۔

" نہ رو کرشن ——— میرے بیٹے ——— میں نے تجھ میں اور خالد میں کبھی فرق نہیں سمجھا۔ اب تو میرا ایک ہی بیٹا سلامت رہ گیا ہے۔ خدا تجھے بری نظر سے بچائے۔"

" ہاں فاطمہ موسی! تم نے تو مجھ میں اور خالد میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ تم بہت نا سمجھ تھیں۔ بھولی تھیں۔ سمجھدار تو وہ لوگ تھے جنھوں نے اس فرق کو بہت اچھی طرح سمجھا اور دوسروں کو بھی سمجھایا۔ تم پھر بھی نہ سمجھ سکیں تو یہ تمہاری بے وقوفی ہی تو ہے فاطمہ موسی۔ اگر تم سمجھدار ہوتیں۔ تو کم از کم آج مجھے تمہارے سامنے اس طرح شرمندہ اور پشیمان نہ ہونا پڑتا۔ تم مجھے جو چاہو سزا دو۔ میں ایک قاتل کا بھائی ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ہی خالد کا قاتل ہوں۔"

میں جتنے دن رہا، میں نے فاطمہ موسی کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گذارا۔ زبان سے تو ان کی تسلی و تشفی میں ایک لفظ کہنے کی جرات نہیں تھی۔ بس ان کی خدمت کر کے اپنے ضمیر پر پڑے ہوئے بوجھ کو کم کرنے کی سعی لاحاصل کرتا رہا۔ میری چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ اور مجھے جانا تھا۔ لیکن اس بار مجھے موسی سے بچھڑنے کا دکھ زیادہ تھا۔

دکھ پہلے بھی ہوتا تھا۔ لیکن یہ اطمینان رہتا تھا کہ خالد ان کے پاس موجود ہے۔ اب انھیں کس کے سہارے چھوڑتا ؟ میں نے اپنے پتاجی اور ماتاجی سے ان کی دیکھ بھال کی تاکید کی۔ اور ان سے وداع ہونے ان کے پاس گیا تو میرا دل بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں خالد کی صورت پھر رہی تھی۔

پہلے تو فاطمہ موسی نے مجھے اپنے ہاتھ سے گاجر کا حلوہ کھلایا۔ پھر امام ضامن میرے بازو پر باندھ کر مجھے اللہ اور رسول کی حفاظت میں دیا۔ اور دعائیں پڑھ کر میرے اوپر دم کیں۔ وہ مجھے دروازہ تک چھوڑنے آئیں۔ اور پھر جب میں نے جھک کر ان کے چرن چھوئے۔ تو کانپتے ہاتھوں سے انھوں نے میرا چہرہ تھام کر پیشانی چوم لی۔ اور رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

" اللہ تیرا حامی و ناصر ہو بیٹا۔"

فاطمہ موسی کی اس محبت پر میرا دل بھر آیا۔ خالد اکثر شرارت سے کہا کرتا تھا۔

" یار جب اماں تیرے امام ضامن باندھتی ہیں تو مجھے بڑا رشک آتا ہے۔ ایک بار اماں سے

امام ضامن بندھوانے کی خاطر باہر ضرور جاؤں گا۔"

"فاطمہ موسی۔ آپ کو بھلا کیا پتا ہوگا کہ خالد اتنی دور چلا جائے گا ورنہ امام ضامن باندھ کر اس کی دیرینہ آرزو ضرور پوری کر دیتیں۔ آپ تو اس لڑائی سے بھی ناواقف تھیں جو ہمارے گھروں میں لڑی جا رہی ہے۔ کاش اس روز آپ کو بھی معلوم ہوتا کہ خالد کتنی دور جا رہا ہے۔ اور آپ اس کے امام ضامن باندھ کر اسکو بھی خدا اور رسول کے حوالے کر کے اس کی جان کی حفاظت کا وعدہ لے لیتیں۔ تو شائد آپ کو خالد کا دکھ نہ اٹھانا پڑتا۔

میں نے فاطمہ موسی کی ملازمت چھڑوا دی بس اب وہ تنہائی کے خیال سے گھر پر ہی کچھ بچوں کو کلام پاک اور اردو پڑھاتی تھیں۔ ماتاجی ان کی ضروریات کا خیال رکھتی تھیں۔ اور میں ہر مہینے باقاعدگی سے ان کو کچھ پیسے بھیج دیتا تھا۔ یہ پیسے ان کو بھیج کر مجھے سکون اور طمانیت کے بجائے بے سکونی اور خجالت کا احساس ہوتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں فاطمہ موسی کو خالد کا خونبہا دے رہا ہوں۔ ہاں یہ خوں بہا ہی تو تھا۔ آج اگر خالد زندہ ہوتا تو کیا موسی کو میرے پیسوں کی ضرورت ہوتی ۔؟ نہیں یہ تو اس کے خون کا معاوضہ تھا جو میں انھیں ادا کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میری دس پشتیں بھی اگر فاطمہ موسی کی خدمت کریں تو خالد کے خون کے ایک قطرے کی قیمت بھی نہیں چکا سکتیں۔ لیکن کبھی کبھی ہم اپنے کو بہلانے کے لئے بھی ایسی بچکانہ حرکتیں کرتے ہیں۔

اچانک ہماری سرحدوں پر جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ جنگ دو پڑوسی ملکوں کی جنگ تھی۔ میں محاذ پر جانے سے پہلے چند روز کی چھٹی لیکر گھر آیا۔ میں کچھ لمحات اپنے گھر والوں کے ساتھ گذارنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کو تو میری فکر تھی۔ اور مجھے صرف تین ہستیوں کی فکر تھی۔ یہ تین ہستیاں تھیں فاطمہ موسی میری پتنی دیپالی، اور میرا بیٹا گوتم۔

میدان جنگ سے کسی کی واپسی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اسلئے اس بار جیسے جیسے میرے جانے کا دن نزدیک آ رہا تھا۔ سب کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ کتنی بار دیپالی میرے سینے سے لگ کر آنسو بہا چکی تھی۔ اور میں اسے سمجھاتے سمجھاتے خود بھی آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ فاطمہ موسی کی بیقراری مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ منھ سے تو کچھ نہیں کہتی تھیں۔ بس دن رات نمازیں پڑھا کرتیں اور میری سلامتی کی دعائیں مانگا کرتیں۔ آخر وہ دن بھی آ ہی گیا۔ اور میں فاطمہ موسی سے رخصت ہونے گیا تو انھوں

نے حسب دستور پہلے مجھے فیرینی کھلائی۔ سفر کے لئے وہ حلوہ سوہن اور کھجوریں پہلے ہی مجھے بھجوا چکی تھیں۔ جو دیپالی نے احتیاط سے ناشتے کی باسکٹ میں رکھدی تھیں۔ پھر موسی نے مجھے کلام پاک کی ہوا دی اور گلابی رنگ کا ریشمی امام ضامن میرے بازو پر باندھ کر دیر تک دعائیں پڑھتی رہیں، پھر انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا دیئے۔

"پاک پروردگار۔ اپنے رسولؐ اور آل رسولؐ کے صدقے میں اسکی حفاظت کرنا۔ اسے دشمنوں سے بچانا اور زندہ سلامت ہم سے ملانا۔" (آمین ثم آمین)

فاطمہ موسی نہ جانے کیا کیا دعائیں مانگتی رہیں۔ میرا دل چاہا کہ ان سے پوچھ لوں۔ "یہ دشمن کون ہیں فاطمہ موسی۔ آپ تو ان کو اچھی طرح جانتی ہیں موسی اور پھر بھی آپ انھیں دشمن کہہ رہی ہیں۔؟ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ ان کے ہاتھوں میری موت سے آپ کے نوجوان اور اکلوتے بیٹے کی موت کا بدلہ پورا ہو جائے گا۔ سچ پوچھئے تو آپ کے دشمن وہ نہیں —— میں ہوں —— کیونکہ خالد کو میں نے قتل کیا ہے۔ آپ کی گود میں نے اجاڑی ہے۔ لیکن آپ تو یہ بات سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہیں۔ اسلئے آپ مجھے کلام پاک کی ہوا دے رہی ہیں۔ اللہ کو رسول کا واسطہ دے کر میری جان کی حفاظت کا وعدہ لے رہی ہیں۔ فاطمہ موسی، آپ کس مٹی سے بنی ہوئی ہیں۔ ذرا مجھے اس مقدس مٹی کا پتہ بتا دیجئے جس سے آپ جیسی عظیم ہستی کی تخلیق ہوئی ہے۔ تاکہ میں اس مٹی کا تبرک چٹکی چٹکی ان سب انسانوں میں بانٹ دوں جو مذہب، نسل، اور قوم کے نام پر —— اپنے ہی گھروں کے آنگن میں ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔

میں جنگ میں اپنا بایاں بازو گنوا کر گھر واپس آیا تو موسی نے دو رکعت نماز شکرانہ میری زندہ سلامت واپسی کے لئے پڑھی۔ اور نذر نیاز کی۔ درگاہ میں چادر چڑھائی۔ اور میرا ہاتھ گوتم کے سر پر رکھکر کہا۔

"کشن! تم گوتم کے سر کی قسم کھا کر وعدہ کرو کہ گوتم کو جنگ میں نہیں بھیجو گے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں موسی۔"

میں نے خلوص سے وعدہ کیا۔ لیکن موسی —— تم پھر بھول گئیں کہ آج کل لڑائیاں صرف میدان جنگ ہی میں نہیں لڑی جاتیں۔ بلکہ قوم قوم پر لڑی جاتی ہیں۔ اس لئے سچی بات تو یہ ہے موسی کہ میں

تم سے گوتم کی زندگی کی حفاظت کا وعدہ نہیں کرسکتا۔ کیا پتہ کب ——— وہ اسی طرح کی کسی لڑائی میں کام آجائے اور تم میرا دامن تھام لو ——— !

فاطمہ موسی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے خاندان میں وہ پہلے کی طرح شامل ہیں۔ ان کی محبت اور احترام میں ہم نے کبھی کوئی کمی نہیں کی۔ جب بھی گھر کا کوئی فرد باہر جانے لگتا ہے۔ فاطمہ موسی کے امام ضامن والے تانبے کے پیسے سے سکہ چھلاکر۔ اس کے امام ضامن باندھا جاتا ہے۔ یہ امام ضامن ہمیں ہمیشہ یہ یاد دلاتا ہے کہ ہمارے ماتا پتا کی طرح ایک اور ہستی بھی تھی جو ہمیں اپنے بیٹے خالد ہی کی طرح عزیز رکھتی تھی۔ کاش! ہم نے بھی اسکی محبت کا حق اسی طرح ادا کیا ہوتا اور خالد کو بچا لیا ہوتا۔ کیا اس خونِ ناحق کو روکنے کا کوئی حل ہمارے پاس نہیں ہے ——؟

چراغ پھولوں کے

اس کے لئے سب کچھ بدل چکا تھا۔ اس کے ابوّ ۔ گھر، زمین اور آسمان سب اجنبی بن چکے تھے بس ایک انا بی تھیں جو ویسی کی ویسی ہی تھیں اور ذرا بھی نہیں بدلی تھیں ان کی محبت، ممتا اور شفقت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اب وہ پہلے سے زیادہ اس کا خیال کرنے لگی تھیں۔ شائد اس لئے کہ وہ پہلے کی برنسبت زیادہ قابل رحم ہو گیا تھا۔ پہلے تو صرف اتنی ہی بات تھی کہ اسکی امی بیمار رہتی تھیں۔ ابوّ کے ظلم اور زیادتیوں نے ان کو بیمار، کمزور اور زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔ وہ انھیں سوکن کا جلاپا دے کر مار رہے تھے۔ امیّ کے سارے زیور انھوں نے دھیرے دھیرے اس عورت کو دیدیئے تھے جب کبھی امی نے ان کے اس ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز بلند کی انھیں چار چوٹ کی مار پڑی۔

انا بی ان کے زخموں پر مرہم لگاتی تھیں۔ دوا کا بھی اور ہمدردی کا بھی۔ لیکن امی کے دل میں پڑے ہوئے گہرے گہرے زخموں کا علاج ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ وہ زخم تھے جو کسی کو نظر نہیں آتے تھے انا بی کو بھی نہیں۔ وہ امی کی بہت دلجوئی کرتی تھیں۔ اور ان کی حالت پر بہت کڑھتی تھیں۔ لیکن امی کے دکھوں کا مُداوا کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ یہ تو وہی کر سکتا تھا۔ جو ان کا شریک زندگی تھا لیکن امی کی زندگی میں اس کی شرکت بس اس حد تک تھی کہ وہ ایک ہی گھر میں مختلف چھتوں کے نیچے سوتے تھے اور وہ ان کے زیور اور جہیز کے سامان پر اپنا پورا حق سمجھتا تھا۔ کیونکہ وہ بڑی دھوم دھام سے برات لے کر اس کے گھر گیا تھا۔ اور واپسی میں نذرانے کے طور پر ڈھیروں جہیز مع ایک بے زبان اور گونگی کنیز کے اس کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ اب اگر وہ کسی دوسری من چاہی عورت کو زیور اور کپڑا دیدیتا تھا۔ تو اس میں کون سی آفت ڈھانے والی بات تھی جو وہ گونگی عورت یوں گلا پھاڑ کر چلاتی اور روتی تھی جیسے اسے کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو۔ اور پھر ایک دن وہ سچ مچ تڑپ تڑپ کر مر گئی۔

اچھی بھلی مجازی خدا کی مار کھا کر لیٹی تھی کہ خون کی ایک بڑی سی قے ہوئی اور روز روز کا قصہ ختم ہوگیا۔

امی کی موت کے بعد ابو اس عورت کو گھر لے آئے اس کے جسم پر امی کی سرخ بنارسی ساڑی تھی اور امی کے سارے زیورات اس کے بدن پر یوں سجے تھے جیسے کسی بیاہ برات میں لے جانے کے لئے دولہا کی سواری کو سجایا جاتا ہے۔ اس نے اپنی امی کو کبھی اس طرح سجا بنا نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہلکے رنگوں کے لباس پہنتی تھیں۔ ان صوفیانہ رنگوں میں ان کی ذات، سکون، شفقت، محبت اور ممتا کا چشمہ نظر آتی تھیں۔ ان کے لمس سے اسے ایک عجیب سی ٹھنڈک اور خوشگوار سی خنکی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ احساس اس دن دکھ کی سرد لہر بن گیا جب وہ ان کے ٹھنڈے اور بیجان جسم سے لپٹ کر رویا اور امی کے بدن کی ٹھنڈک بڑھتی گئی۔

نئی عورت گھر میں آئی تو پہلے گھر کا نقشہ بدلا۔ امی کے کمرے پر اس نے قبضہ کرلیا۔ اور ابو کا بستر جو ہمیشہ باہر کے کمرے میں لگا رہتا تھا۔ اس نے اپنے کمرہ میں لگوالیا۔ اور وہ امی کے کمرے سے نکل کر اپنی انابی کے کمرے میں آگیا۔ انابی نے اس کا ننھا سا کھٹولا اپنے پلنگ کے پاس بچھالیا۔ لیکن وہ ایک رات بھی اپنے کھٹولے پر نہیں سویا۔ بلکہ انابی کے ساتھ ان سے لپٹ کر سویا اور مزے مزے کے خواب دیکھتا رہا۔

ابو کو بھی امی کے مارنے پیٹنے سے نجات مل گئی تھی۔ اب وہ اطمینان سے لیٹے بیٹھے رہتے تھے اور ہنس ہنس کر اس عورت سے باتیں کرتے رہتے یا پھر دونوں گھومنے پھرنے نکل جاتے۔ واپس آتے تو سامان کے پیکٹوں اور مٹھائی کے ڈبوں سے لدے پھندے ہوتے۔ لیکن وہ ان کے سامان پر نظر تک نہیں ڈالتا تھا۔ انابی کام کاج سے فرصت کر کے، کرتے کاڑھتی تھیں یا دوپٹوں اور ساڑیوں پر کامدانی بناتی تھیں۔ اور اجرت کے پیسوں سے وہ اسکے لئے اچھی اچھی چیزیں لاتی تھیں۔

نئی عورت اس کو مارنے اور ڈانٹنے کے بہانے ڈھونڈھتی تھی۔ لیکن انابی اس کے لئے ایک ایسا سائبان بن گئی تھیں جسکے نیچے وہ ہر بات سے محفوظ رہتا تھا۔ سچ مچ انابی اس کے لئے ریگزار میں اگے چینار درخت کے مانند تھیں۔ جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ دنیا کے گرم و سرد سے بے نیاز چین کی میٹھی نیند سوتا تھا۔

پھر اس عورت کے پاس ایک منی سی گڑیا آگئی۔ اسے دیکھنے اور چھونے کے لئے اس کا ننھا سا دل مچل اٹھا۔ ایک بار تو وہ ہمت کر کے کمرےکے اندر بھی چلا گیا۔ لیکن عورت نے اسے ڈانٹ دیا۔

"او منحوس چل بھاگ یہاں سے۔"

"میرا نام شوبی ہے"۔ اس نے دھیرے سے کہا۔

"کم بخت پہلے تو اپنی ماں کو کھا گیا۔ اب میری منی کو نظر لگانے آگیا۔" اس نے چپل کھینچ ماری وہ ہٹ گیا ورنہ بہت چوٹ آتی۔ اسی وقت منی رونے لگی۔ اور اس کی جان بچی۔ پھر تو منی ہر ایسے موقع پر رونے لگتی تھی جب وہ عورت اسکے ساتھ زیادتی کرتی تھی۔ وہ منی کو بہت چاہتا تھا۔ وہ اسکول جانے لگا تو ایک دم ڈھیر ساری خوشیاں اسکو مل گئیں۔ نئے نئے دوست اور پیاری پیاری "مس" سب ایسی محبت کرتی تھیں کہ اسے اپنی امی اور انابی یاد آجاتی تھیں۔

انابی نے ابو کی خوشامد درامد کر کے اسکا نام تو اسکول میں لکھوا دیا تھا۔ لیکن ہر مہینے فیس اور دوسرے اخراجات پر نئی عورت بخ بخ کرتی تھی۔ انابی اب دن رات زیادہ سے زیادہ محنت کر کے پیسہ جمع کرتی تھیں اور اسکی ضروریات پوری کرتی تھیں۔ جیسے جیسے اس کے کلاس بڑھتے گئے۔ انابی کی آنکھوں کی روشنی گھٹتی گئی۔ اب وہ موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ لگا کر کڑھائی کرتی تھیں۔ اس نے انابی کو رات گئے تک کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے دو ٹیوشن بھی کر لئے تھے اور اپنی بہت سی ضروریات کے لئے وہ اپنی پیاری انابی کو پریشان نہیں کرتا تھا۔ انابی کی دعاؤں اور اپنی محنت اور لگن سے اس نے ہر امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ جب میڈیکل کالج میں اس کے داخلے کا وقت آیا تو ابو نے پیسے دینے سے صاف انکار کر دیا اور انابی نے اپنی چاندی کی ڈاب (کمر کی پٹی) بیچ کر اس کی فیس وغیرہ کا انتظام کیا ابو کی ساری توجہ نئی عورت اور بچوں پر مرکوز تھی۔ منی کے بعد پانچ بھائی بہن اور آگئے تھے اتنے لوگوں کے اخراجات پورے کرنے کے بعد اس کے لئے کچھ نہیں بچتا تھا۔ اسے تو بیچارے ابو پر بڑا ترس آتا تھا۔ اب امی کی جگہ انھوں نے لے لی تھی۔ اور نئی عورت دن رات ان سے لڑا کرتی تھی۔ اسے تو ڈر لگتا تھا کہ کہیں ابو بھی امی کی طرح ٹھنڈے برف نہ ہو جائیں وہ پہلے سے کمزور بھی بہت ہو گئے تھے۔

جب وہ اپنا سفید کوٹ پہن کر اور گلے میں آلہ ڈال کر میڈیکل کالج جانے کے لئے تیار ہوتا تھا تو انابی اس کی نظر ضرور اتارتی تھیں۔ اس بات پر منی اسے بہت چڑھاتی تھی۔ وہ منی کی کسی بات کا برا نہیں مانتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔؟

جس دن اس کے دروازے "پر ڈاکٹر شباب احمد ایم بی بی ایس" کی نیم پلیٹ آویزاں ہوئی اس دن انابی دیر تک سجدے میں پڑی روتی رہیں۔ اور انھوں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر ڈھیروں پیار کر ڈالے۔ وہ انھیں دروازے پر لے گیا اور انابی نے ہاتھوں سے چھو چھو کر نیم پلیٹ پر لکھے اسکے نام اور ڈگریوں کو محسوس کیا۔ اس دن ان کو اپنی جہالت پر بڑا رنج ہوا۔ کاش وہ اپنے بچے کا نام خود پڑھ سکتیں۔ آنسوؤں نے دھند کی چادر سی آنکھوں کے سامنے تان دی تھی۔ ویسے بھی اب اکثر ان کی نظروں کے سامنے دھند سی چھا جاتی تھی۔ وہ ان کی آنکھوں کا علاج کرا رہا تھا۔ ڈاکٹر آپریشن بتاتے تھے۔ موتیا بند بغیر آپریشن کے ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا اور انابی آپریشن کے نام سے گھبراتی تھیں۔ بہر حال اسے امید تھی کہ ایک روز وہ انھیں منا لے گا۔

پروفیسر صدیقی نے اسے اپنی بیٹی ناہید کے لئے پسند کر لیا۔ ناہید اسے بھی پسند تھی۔ لیکن وہ پہلے ایم ڈی کرنا چاہتا تھا۔ پروفیسر صدیقی نے اس کی بات تھوڑی سی ترمیم کے بعد مان لی۔ اور عقد کر کے باہر جانے کی اجازت دیدی۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی انابی کا ہاتھ ناہید کے ہاتھ میں دیکر کہا۔

"ناہید! یہ بوڑھی اور کمزور ہستی مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ واپس آکر میں اپنی امانت تم سے واپس لوں گا ناہید۔"

انابی بے آواز رو دیں تو وہ بھی ننھے سے بچے کی طرح مچل کر ان کی گود میں لیٹ گیا۔

"میری پیاری انابی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے کے بعد میں کہیں نہیں جا سکتا انابی۔"

"پگلے۔ یہ تو دو دھار دودھ پلانے کی ممتا امڈ آئی ورنہ میں تو بہت خوش ہوں میرے لال خدا وہ دن لائے کہ تم بہت بڑے ڈاکٹر بن کر اصل خیر سے گھر آؤ۔"

"پھر میں آپ کی آنکھوں کا آپریشن بھی کراؤں گا۔"

"ابھی ان بوڑھی آنکھوں میں اتنی روشنی ہے کہ میں تمہارے بچوں کو دیکھ سکوں۔ بس یہ خیال رہے کہ واپسی جلدی ہو۔ بیٹا! اب زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

"نہیں انابی۔ ابھی آپ بہت سا جئیں گی۔ ابھی تو مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے۔ آپکے احسانوں کا قرض تو میں کبھی نہیں اتار سکتا انابی۔ ممتا جیسی لازوال دولت کا جو خزانہ آپ نے میرے اوپر لٹایا ہے

میرے پاس اس کی پاسنگ بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ بس میں آپ کی جی بھر کے خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے قدموں کے نیچے میری جنت ہے انابی"۔ شوبی نے ان کے قدموں کو بوسہ دیا اور سسکتا ہوا ان سے لپٹ گیا۔

شوبی ہر ہفتے پابندی سے انابی اور ناہید کو خط لکھتا تھا۔ وطن سے دور ہوں تو چند لفظوں کی قدر و قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔ پھر ایک دن ناہید کا خط آیا کہ وہ انابی کو اپنے پاس ہی لے آئی ہے۔ کیونکہ وہاں تنہا رہ کر وہ بہت اداس ہو گئی تھیں۔ اسے بھی اطمینان ہو گیا اور وہ یکسوئی سے اپنی تعلیم میں معروف ہو گیا۔ انابی کو وہ اب بھی علیحدہ سے خط لکھتا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح ناہید ہی ان کی طرف سے جواب لکھتی تھی۔ پھر وہ دن بھی آگیا جب اس نے انابی اور ناہید کو اپنی واپسی کی خوش خبری بھیجی اور تحفوں سے لدا ہوا گھر پہنچ گیا۔

ڈرائنگ روم میں گھر کے سب لوگ اکٹھا تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ ناہید چپ چپ ہے اور اس کی انابی بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہ ان کی قدمبوسی کے لئے بے چین ہو اٹھا۔

"ناہید۔ مجھے میری انابی کے پاس لے چلو"۔

"انابی ـــــ وہ ـــــ وہ" ـــــ ناہید کے ہونٹ کانپنے اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"کیسی ہیں انابی"۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر صدیقی نے اسے بازوؤں میں سنبھال لیا اور حلیمی سے بولے۔

"بزرگ خاتون کا وقت پورا ہو چکا تھا بیٹا۔ صبر سے کام لو"۔

"کب ـــــ کب؟" ـــــ اسکی آواز لرز گئی۔ اس کا وجود خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپنے لگا۔ صدیقی صاحب اسے سنبھالے نہ ہوتے تو وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔

"ان کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ مہینے ہو چکے ہیں"۔

"لیکن وہ ـــــ خط" ـــــ؟

"مرحومہ کی وصیت تھی کہ پردیس میں میرے بچے کو پریشان نہ کیا جائے۔ اور ان کی موت کی اطلاع نہ دی جائے ـــــ"

"ناہید مجھے وہاں لے چلو جہاں میری انابی سو رہی ہیں"۔

ناہید انھیں انابی کی قبر پر لے گئی۔ اور وہ مٹی کے ڈھیر سے لپٹ کر سسک اٹھا۔ اب روزانہ صبح انابی کی قبر پہ جانا اس کا معمول بن گیا تھا۔ اس نے ان کی قبر کے چاروں طرف گلاب کے پودے لگائے تھے وہ اپنے ہاتھ سے پودوں کو پانی دیتا تھا۔ اس دوران اس کو بحرین سے ملازمت کا آفر ملا لیکن وہ ٹالتا رہا۔ اسے تو گلابوں کے کھلنے کا انتظار تھا۔ پھر وہ دن بھی آگیا جب ننھی منی کلیاں کھل کر پھول بننے لگیں۔

باہر جانے سے پہلے وہ اپنی انابی سے رخصت ہونے کے لئے گیا۔ اور قبر پر جھک گیا۔

"میری پیاری انابی! لوگ قبروں پر چراغ روشن کرتے ہیں۔ میں اتنی دور جا رہا ہوں کہ یہ خدمت انجام نہیں دے سکوں گا۔ اس لئے میں نے آپکی قبر پر پھول لگائے ہیں۔ پھولوں کے یہ چراغ نسل انسانی کو محبت، وفا، ممتا اور ایثار کا پیغام دیں گے۔ ان کی خوشبو روشنی کی مانند چاروں طرف پھیلے گی۔ اور میری پیاری انابی پھولوں کے یہ چراغ ہمیشہ روشن رہیں گے۔

مسعود جہاں کی دوسری کتب

کتاب	نوعیت
دھوپ دھوپ سایہ	افسانوی مجموعہ
راہوں میں	ناول
آواز نہ دو	"
اچانک	"
خزاؤں سے دور	"
شام وسحر	"
رشتہ پیار کا	"
رنگ ہزار	"
ارمانوں کا خون	"
اجالے	"
دھوپ چھاؤں	"
رومہ	"
تاباں	"
تزئین	"
پیکر	"
شہسوار	"
ہمنشیں	"
پیار کی خوشبو	"
سفینہ	"
طاہرہ	"
راشدہ	ناول
آشیانہ	"
غم دل	"
پتھر کا دیوتا	"
شِگاف	"
ایک مٹھی بوجھ	"
روبینہ	"
ارم	"
کنول	"
رقیہ	"
خالدہ	"
تنویر	"
تمثیلہ	"
نبیلہ	"
گردشیں	"
فرح	"
درد کا ساحل	"
نئی صبح	"
توصیف	"

بے حیائی کے مختلف روپ

فاسد ماحول میں ـــــــ بے حیائی ہر سمت سے نئے نئے اسلحے کے ساتھ حملہ آور ہوتی ہے اور بار بار حملہ آور ہوتی ہے۔ وہ بناؤ سنگار کر کے نکلتی ہے، وہ نمائش اور مظاہرے کی اسپرٹ کے ساتھ آگے بڑھتی ہے، وہ شعر کا لباس پہنتی ہے، وہ افسانے کا کا[illegible] بھرتی ہے۔ وہ صحافت و ادب کے میدان میں مسند آرا ہوتی ہے، وہ اشتہاروں میں نمایاں ہوتی ہے، وہ تصویر کا کاغذی پیرہن زیب تن کرتی ہے، وہ رقص گاہوں میں ناچتی ہے وہ مینا بازار لگاتی ہے، وہ کیمروں کے سامنے پریڈ کرتی ہے، وہ ضیافتوں اور دعوتوں میں پیش پیش رہتی ہے، وہ سینماؤں میں ہنگامے مچاتی ہے وہ ریڈیو سے طوفان صوت بن کر بہتی ہے۔

یہ فاسد ماحول کا جادو ہوتا ہے کہ سب بے حیائی اور بے عصمتی "ترقی پسندی" "تہذیب اور کلچر" کی علامت قرار دی جاتی ہے۔ ("تخریب و تعمیر")

نعیم صدیقی